امالی غلام محمد: محترم سہیل عمر صاحب کے اعتراضات کا جائزہ

کیا اقبال عالمِ دین تھے یا طالبِ علمِ دین

[ساحل کی تحقیق مختصراً یہ ہے کہ اقبالؒ نے خطبات کے موقف سے رجوع کرلیا تھا۔ اقبال اکادمی کا اصرار ہے کہ اقبال آخری وقت تک الحاد وزندقہ پر قائم تھے۔ ساحل نے ستمبر کے شمارے میں لکھا تھا کہ اگر اکادمی حضرت علامہ اقبالؒ کو عالم دین کے بجائے طالب علمِ دین تسلیم کرے تو مباحثہ ختم ہوجائے گا لیکن اکادمی کی جانب سے ابھی تک مثبت جواب موصول نہیں ہوا۔ سہیل عمر صاحب کے نقد میں جتنے بھی اعتراضات اٹھائے گئے تھے ان تمام کا جواب تمام حوالوں کے ساتھ حاضر ہے آئندہ شماروں میں اقبال کے فکر وفلسفے کا ناقدانہ جائزہ قسط وار پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی کیونکہ بے شمار مباحث ملتوی نہیں کئے جاسکتے]۔

امالی غلام محمد پر نقد کرتے ہوئے اکادمی نے موقف اختیار کیا ہے کہ اقبال کے رجوع کی سند معتبر نہیں ہے اکادمی کا یہ موقف کس قدر مضبوط ہے اس کے لئے ذیل میں ہم سہیل عمر صاحب کے منہاج تحقیق کے مطابق دو معاملات قارئین کے سامنے پیش کررہے ہیں ان معاملات میں سہیل عمر صاحب نے اقبالؒ کو راسخ العقیدہ مسلمانوں کے اعتراضات سے بچانے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کا اجمالی ذکر امالی غلام محمد کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔

سنت وحدیث: اقبالؒ کا رجوع: سہیل عمر کی تحقیق:

خطبات میں علامہ اقبال نے گولڈ تسیھر کی تحقیقات پر اعتماد کرتے ہوئے سنت وحدیث کو ساقط الاعتبار یعنی ناقابل اعتبار ماخذ دین قرار دیا ہے۔ اور واضح طور پر لکھا ہے کہ

Among their modern critics Professor Goldziher has subjected them to a searching examination in the light of modern canons of historial criticism and arrives at the conclusion that they are on the whole untrust worthy.

حضرت علامہ اقبال نے یہ عبارت غالباً ۱۹۲۶ء میں تحریر کی ۱۹۳۰ء میں خطبات کتابی شکل میں پہلی مرتبہ لاہور سے شائع ہوئے تو یہ عبارت موجود تھی ۱۹۳۳ میں جب حضرت اقبال نے خطبات پر نظر ثانی کر کے اشاعت ثانی کے لیے مسودہ آکسفورڈ یونیورسٹی کو دیا تب بھی اس عبارت کو تبدیل نہیں کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال ۱۹۳۳ء میں بھی سنت و حدیث کو ایک مستشرق کی پیروی بلکہ تقلید میں ماخذ دین تسلیم نہیں کرتے تھے لیکن اقبال اکادمی کے ناظم سہیل عمر نے اس

موقف سے اقبال کے رجوع کے سلسلے میں جو تحقیق پیش کی ہے وہ حیران کن ہے اقبال ریویو میں اپنے مضمون میں [یہ مضمون ساحل کے نمبر ۲۰۰۶ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے] سہیل عمر صاحب لکھتے ہیں کہ [عبارت نمبر ایک] "علامہ اقبالؒ نے مخاطب کے مسلمات فکر کی رعایت کرتے ہوئے انھی کے حوالے سے تعبیر دین یا تعبیر حقائق کا طریقہ تطبیق اختیار کیا تاکہ مخاطب ان کا نقطہ نظر سمجھ سکے اس وقت تک مغربی تعلیم یافتہ گروہ مسلم پر مغرب کی تنقید کا رعب طاری تھا اور علمی جواب دینے کی اہلیت نہ اس طبقے میں تھی نہ علمائے وقت میں اقبال کا محتاط رویہ اور گریز اسی مجبوری کا نتیجہ تھا. [ص ۲۱، ۲۲ ساحل ستمبر ۲۰۰۶ء]

اسی مضمون کے حاشیے ۱۲ کی تشریح کرتے ہوئے سہیل عمر صاحب نے عجیب وغریب نکتہ پیدا کیا ہے کہ [عبارت نمبر دو] "سنت و حدیث کے بارے میں علامہ اقبال کی اصل رائے کچھ اور تھی . اس کا اندازہ ہمیں علامہ کے اس غیر مطبوعہ خط سے ہوتا ہے .جو ادھر چند سال پہلے دریافت ہوا ہے عبداللہ عمادی کے نام ۱۹۱۸ء میں لکھتے ہیں کہ مولوی صدر الدین لاہور کو میں نے اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ گولڈ نے جو تنقیداحادیث کی ہے اسے اردو میں ترجمہ کرڈالیں اگر آپ یہاں ہوتے تو گولڈ کی تنقید کی تردیدمیں آپ سے گراں بہا مدد ملتی. اس عبارت کی روشنی میں تشکیل جدید کا وہ حصہ سنت و حدیث سے متعلق ہے دوبارہ دیکھیے تو یہ کھناکسی طرح ممکن نہیں رہتا کہ علامہ نے گولڈ کی رائے قبول کرلی تھی" [ص ۲۶ ساحل ستمبر]. سہیل عمر صاحب کا یہ موقف اغلاط کا دفتر ہے اس کا تنقیدی جائزہ لینے سے قبل سہیل عمر صاحب کا یہ موقف بھی پڑھ لیجیے [عبارت نمبر تین] "صفحات آئندہ میں ہم ظفر اسحاق انصاری کے ایک اہم مقالے کا اردو ترجمہ پیش کررہے ہیں مقالہ اپنی علمی اور تحقیقی جہت سے اتنا اہم اور موثرہے کہ ہم یہ کہنے میں کوئی مبالغہ تصور نہیں کرتے کہ اگر یہ مقالہ ۱۹۲۰ء میں چھپ گیا ہوتا تو تشکیل جدید کے پانچویں خطبے کی مذکورہ عبارت [متعلق حدیث وسنت] قطعاً مختلف ہوتی.[ساحل ص ۲۳ ستمبر ۲۰۰۶ء] یہ تینوں عبارتیں ایک دوسرے کی تردید کررہی ہیں۔ تین مختلف موقف ہیں، تینوں کا مقصود اقبالؒ کا دفاع ہے اور انھیں انکار سنت کے الزام سے بری الذمہ قرار دینا ہے لیکن تینوں عبارتیں متوازی راہوں پر محوسفر ہیں۔

[۱] اگر اقبالؒ ظفر اسحاق انصاری کا مقالہ ۱۹۲۰ء میں پڑھ لیتے تو وہ سنت وحدیث کو ماخذ قانون تسلیم کر لیتے اور تشکیل کے پانچویں خطبے کی عبارت مختلف ہوتی اس کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ یہ مقالہ اقبال کی نظر سے نہیں گزرا لہٰذا انھوں نے مذکورہ عبارت کو تبدیل نہ کیا اور اقبالؒ مغرب سے مرعوبیت کے باعث سنت وحدیث کے بارے میں گولڈ کے موقف کو درست ماننے پر مجبور ہوگئے۔ ظفر اسحاق انصاری کی گولڈ پر تنقید پڑھ لیتے تو سنت وحدیث پر اپنے موقف سے رجوع کر لیتے۔ اس عبارت سے یہ بات قطعی الدلالت ہے کہ اقبالؒ سنت وحدیث کو ماخذ تسلیم نہیں کرتے۔

[۲] اس سوال پر بھی غور کی ضرورت ہے کہ علامہ اقبال جرمن زبان پر کس قدر عبور رکھتے تھے۔ کیا جرمن زبان کی امہات کتب کی قرأت پر اقبال قادر تھے؟ کیا وہ اعلیٰ سطح کی جرمن تحقیقی کتابوں کے متون کا فہم رکھتے تھے؟ ان کی جرمن استعداد کتنی تھی؟ یہ سوال اس لیے ضروری ہے کہ آیا اقبالؒ نے مشہور جرمن مستشرق گولڈ کا احادیث پر نقد کا خود مطالعہ فرمایا تھا یا ثانوی ماخذات سے اس کے نقد کا علم حاصل کیا تھا؟ ڈاکٹر اختر سعید درانی کی تحقیقات کے مطابق اقبال جرمن زبان پر عبور

نہ رکھتے تھے۔[ص۲۶۴،ص۲۶۵،اقبال یورپ میں]

[۳] جرمن زبان پر عبور کا مغالطہ عطیہ فیضی کی کتاب میں اقبال کی جرمن دانی کے خود ساختہ واقعے سے پیدا ہوا تھا۔ [اقبال عطیہ فیضی مترجم عبدالعزیز خالد،ص۲۷-۲۶] جب کہ اقبال کو جرمن لکھنے کی مشق نہ تھی۔ ویگے ناسٹ کے نام اقبال کے ۲۷ خطوط میں سے ۱۷ خطوط شکستہ جرمن میں اور دس خط انگریزی میں ہیں۔ خط ۱۹۳۷ء تک کے زمانے کے ہیں، اسی زمانے میں اقبال نے گولٹ کے مسئلے پر عبداللہ عمادی سے خط و کتابت کی ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب اقبال ویگے ناسٹ کو انگریزی میں خطوط لکھ رہے تھے۔

[۴] ۱۷/جنوری ۱۹۳۲ء کو ویگے ناسٹ کے نام انگریزی خط میں اقبال اعتراف کرتے ہیں کہ ''میں جرمن زبان کے ساتھ اپنا رابطہ قائم نہیں رکھ سکا ہوں لیکن میں ہمیشہ آپ کے خطوط کو جرمن لغت کی مدد سے پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہوں بجائے اس کے کسی اور سے ان کا ترجمہ کراؤں آپ کے خط ختم کرنے میں خواہ تین دن لگیں پھر میں بھی اپنے طور پر انھیں لغت کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں، میں نہیں چاہتا کہ یہ کسی اور کو دکھاؤں اور میں نے ہمیشہ یہی پیرایہ عمل اختیار کیا۔ [ص۲۱۴،اقبال یورپ میں]۔[اقبال اور شبلی کے اظہار جذبات میں کس قدر فرق سے اس کا اندازہ شبلی کے خطوط بنام عطیہ اور اقبال کے خطوط بنام عطیہ اور ویگے ناست کے تقابلی مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ اقبال کے عشق میں کوہساروں کا وقار اور متانت و سنجیدگی ہے، سب سے اہم بات اخفاء اور حدود کا خیال اس اعتبار سے وہ ایک حدیث کے مطابق شہید راہ محبت کے درجے پر فائز ہو جاتے ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس حدیث سے بعض مسائل کا استنباط کیا ہے جو ان شہدائے راہِ عشق سے متعلق ہیں، جنھوں نے عفت اور پاک دامنی کا لحاظ رکھا اس معاملے کی تشہیر نہ کی۔ شبلی کے یہاں عشق فسق کے درجے سے آگے چلا جاتا ہے اور حرص و ہوس کے الفاظ بھی ان کے جذبات کی ترجمانی سے قاصر ہیں۔ شبلی کی بوالہوسی کا عالم یہ تھا کہ اپنے صاحبزادے کی منسوبہ [منگیتر] لڑکی سے نکاح فرمایا جس کے باعث حامد گھر چھوڑ کر چلے گئے اور تارک دنیا بن گئے۔ ''حیات شبلی'' پر ابوالکلام کے حواشی یہ راز بے نقاب کرتے ہیں، دستہ گل کی غزلوں سے ہوس ناکی کی بو آتی ہے۔ عطیہ کو مردانہ رنگ میں دیکھنے کی آرزو شبلی کے ذوق عجم کی نثری تفسیر ہے جس کے باعث ندوہ سے ان کا اخراج ہوا۔ ان پر اہم الزام یہی تھا کہ شبلی کی صحبت سے لڑکے بگڑ جاتے ہیں۔ دوسرا الزام ابوالکلام سے ان کا تعلق دیرینہ تھا۔ شبلی نے کبھی ان الزامات کی تردید نہ کی۔ ایک خط میں ابوالکلام کو لکھتے ہیں: دن رات وحشت کدے میں بسر نہیں ہو سکتے، شیعوں کے عملی فلسفے کی کوئی صورت پیدا ہو تو البتہ ممکن ہے۔ [مکاتیب شبلی مکتوب نمبر۵] [شبلی اور اقبالؒ کے یہاں ایک متفقہ رجحان شیعہ حضرات کے حوالے سے نظر آتا ہے، جو عجیب ہے مثلاً اقبال کہتے ہیں کہ صوفی ہونے سے شیعہ ہونا بہتر ہے، پھر شیعہ ہونے پر شدید نقد فرماتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند شیعوں کے اشارے پر ناچ رہے ہیں پھر شیعہ عالم علامہ طہرانی سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ یہ تنوع عجیب ہے۔] شبلی کا معاملہ صرف ذوق عجم پر ختم نہیں ہوتا گزند پاء کا واقعہ اپنی بہو پر دست درازی کا نتیجہ تھا۔ یہ واقعہ تاریخ کی بھول بھلیوں میں گم نہیں ہو سکا۔ تفصیلات آئندہ ملاحظہ کیجیے۔ جب شبلی اور اقبالؒ کے کردار کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔ شبلی اول و آخر جدیدیت پسند تھے اور جدیدیت و اباحیت لازم و ملزوم ہیں۔ آخر عمر میں شبلی کے یہاں بھی رجعت نظر آتی ہے لیکن اقبالؒ کے مقابلے میں بہت کم اقبالؒ جدیدیت کے سفر سے لوٹ آئے تھے۔ رجوع، توبہ، عشق رسالت مآب علماء کرام سے استفادہ مصلے پر آہ زاری تہجد گزاری اور سحر خیزی ان کے آخری زمانے کے روحانی مظاہر ہیں۔ شبلی کی زندگی ان مظاہر سے یکسر خالی رہی۔ یہاں اقبال ایک عظیم الشان مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں اور شبلی ایک ہرجائی نظر آتے ہیں، جو بے صبری کے ہاتھوں اپنا دامن شوق تار تار کر رہا ہے]

[۵] اگر سہیل عمر صاحب اقبال کی جرمن سے واقفیت کے مسئلے پر ڈاکٹر درانی کی تحقیق اور اقبال کے خط بنام ویگے ناست کو قابل اعتناء سمجھیں تو پھر یہ بات از سر نو تحقیق کی محتاج ہے کہ اقبال نے خطبات میں سنت وحدیث کے رد کے سلسلے میں گولٹ کی تحقیقات پر جو انحصار کیا اس کا ماخذ کیا تھا؟ [ڈاکٹر درانی نے اپنی کتاب ''اقبال یورپ میں'' ص ۲۱۹ تا ۲۲۹ اقبالؒ کی جرمن زبان کی اغلاط کی نشاندہی کی ہے]

[۶] سہیل عمر صاحب نے لکھا ہے کہ اقبال ۱۹۱۸ء میں سنت وحدیث کو ماخذ قانون تسلیم کرتے تھے اس خیال کی بنیاد اقبال کا وہ عندیہ ہے جو وہ گولٹ پر تنقید کے ضمن میں ۱۹۱۸ء میں عبداللہ عمادی کو دے رہے ہیں۔ اب لکھ رہے ہیں کہ ۱۹۲۰ میں اگر اقبال ظفر اسحاق انصاری کا مقالہ پڑھ لیتے تو خطبات کی عبارت مختلف ہوتی اس سے پہلے اقبال کی جانب سے حدیث وسنت کے استرداد کی توجیہہ کو سہیل عمر صاحب نے اقبال کا وہ طریقہ گفتگو بتایا ہے جس کے ذریعے مخاطب کے ذہنی مسلمات کے ذریعے اسے اسلام سے قریب لایا جائے سہیل عمر صاحب کی کون سی توجیہہ اور دلیل درست ہے یہ وہی بہتر جانتے ہیں۔ خطبات کی تحریر کا زمانہ خرم شفیق نے اپنی کتاب اقبال کی تصویری سوانح میں ناظم اقبال اکادمی کی رہنمائی میں متعین کیا ہے اور یہ زمانہ بھی حتمی نہیں ہے کیونکہ مکاتیب اقبال اور اقبالنامہ کے خطوط سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اقبال نے خطبہ اجتہاد ۱۹۲۰ میں لکھنا شروع کیا تھا اور ۱۹۲۳ء میں اسے مکمل کر کے ۱۹۲۴ء میں تصحیح ونظر ثانی کے لئے مختلف علماء سے خط وکتابت اور رابطوں میں مصروف تھے افسوس کی بات یہ ہے کہ اقبال اکادمی کی شائع کردہ کتاب میں خطبات کے دور تحریر کا درست تعین نہیں کیا جا سکا اور سہیل عمر اور خرم علی شفیق اس معاملے میں یک سو اور ہم آہنگ نہیں ہو سکے۔ [تفصیلات کے لیے دیکھیے ص ۱۲۶ [Iqbal An Illustrated Biography] اور سہیل عمر صاحب کا مضمون مشمولہ ساحل ستمبر ۲۰۰۶ء] اقبال بلا شک وشبہ قرآن وسنت کو ماخذ قانون تسلیم کرتے تھے لیکن اس موقف کے لئے واحد طریقہ استدلال یہی ہے کہ سلیمان ندوی کے نقد اقبال یعنی امالی غلام محمد کی صداقت کو تسلیم کیا جائے تب یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نے سنت وحدیث کے موقف سے رجوع کر لیا تھا لیکن سہیل عمر صاحب کے منہاج تحقیق کے مطابق اقبال کے رجوع کی بات غیر مصدقہ ہے کیونکہ خطبہ ۱۹۲۶ء میں لکھا گیا ہے اور سہیل عمر ۱۹۱۸ء میں عبداللہ عمادی کے نام اقبال کے خط سے یہ استشہاد فرما رہے ہیں کہ ''سنت وحدیث کے سلسلے میں اقبال کی رائے کچھ اور تھی اور عبداللہ عمادی کے نام اقبال کے خط کی عبارت کی روشنی میں تشکیل جدید کا متعلقہ حصہ دوبارہ دیکھیے تو یہ کہنا کسی طرح ممکن نہیں رہتا کہ علامہ نے گولٹ کی رائے قبول کر لی تھی۔ [سہیل عمر ص ۲۶ حاشیہ ۱۲ ساحل ستمبر ۲۰۰۶ء] جناب سہیل عمر کے استدلال سے یہ استنباط بھی تو ممکن ہے کہ اقبال ۱۹۱۸ء میں سنت کو ماخذ قانون تسلیم کرتے تھے لیکن ۱۹۲۶ء میں جب اقبالؒ نے خطبہ لکھا تو اس وقت اپنی سابقہ رائے سے رجوع کر لیا اور گولٹ کی رائے اختیار کر لی لیکن اگر سہیل عمر صاحب کا موقف تسلیم کیا جائے تو سہیل عمر کا یہ استنباط صرف امالی غلام محمد کی روشنی میں قبول کیا جا سکتا ہے اس کے سوا کوئی اور قرینہ ان کے موقف کی مضبوط دلیل نہیں بن سکتا۔

[۷] مذکورہ خطبہ اقبال نے ۱۹۲۶ء میں لکھا اور حدیث وسنت سے متعلق خطبات کی عبارت ۱۹۳۳ء میں نظر ثانی کے بعد بھی برقرار رہی اس صورت میں علامہ اقبال ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء میں سنت وحدیث کے موقف پر کیسے قائم تھے یا اس موقف سے کیسے رجوع کر لیا تھا جبکہ سنت وحدیث کے بارے میں خطبات کے ذریعے ان کا موقف ابھی تک تحریری طور پر سامنے بھی نہیں آیا تھا۔ ''اقبال کامل'' کے مصنف نے شاید اسی بنیاد پر اقبال کو ''اہل قرآن'' کی صف میں رکھا ہے۔

[۸] ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۳ء میں خطبات دو مرتبہ شائع ہوئے لیکن اقبال نے مذکورہ صدر عبارت تبدیل نہیں کی پھر سہیل عمر صاحب نے یہ نتیجہ کیسے اخذ فرمایا کہ اقبال سنت وحدیث کو ماخذ قانون تسلیم کرتے تھے یا تسلیم کرنے لگے تھے۔ سہیل عمر

کے موقف کی تردید ۱۹۲۵ء میں اقبال کے اس خط سے ہوتی ہے جو صوفی تبسم کے نام احمد دین امرتسری کے حوالے سے لکھا گیا۔.....کیا ہی اچھا ہو کہ وہ شریعت محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں جس میں عبادت و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو معاملات کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آج کل شدید ضرورت ہے ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے ہاں دوسرے ممالک اسلامی میں اس کی ضرورت کا احساس بڑھ رہا ہے [ص ۱۹۷ اقبالنامہ اکادمی حاشیے میں لکھا ہے کہ صرف قرآن کا لفظ ڈاکٹر صاحب کے معتقدات پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالتا ہے]۔ غرض یہ کہ مولوی صاحب موصوف یا ان کے رفقاء کو جو کلام الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں اس طرف توجہ کرنی چاہیے میں اور مجھ جیسے اور لوگ جو صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں ایک مدت سے ہم سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے زمانہ حال کے فقہا یا تو زمانہ کے میلان سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا میں ہیں[۹۷۔۱۹۸ اقبالنامہ]۔ صوفی تبسم کے نام اقبال کا یہ خط اور اس پر لکھا گیا حاشیہ کہ صرف قرآن کا لفظ ڈاکٹر صاحب کے معتقدات پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالتا ہے قابل توجہ ہے۔ اگر سلیمان ندوی کہتے ہیں کہ اقبال نے کفر و الحاد سے رجوع کر لیا تھا تو سہیل عمر ثابت کرتے ہیں کہ اقبال آخر وقت تک کفر و الحاد پر قائم تھے رجوع کا دعویٰ غلط ہے لیکن سہیل عمر کا یہ دعوی کس منہاج تحقیق کے تحت تسلیم کیا جائے؟ ۱۹۲۵ء میں صوفی تبسم کے نام خط اور ۱۹۲۶ء میں خطبہ کی وہ عبارت جو انکار سنت و حدیث پر مبنی ہے ان کے درمیان تو مماثلت تلاش کی جاسکتی ہے لیکن سہیل عمر صاحب کے بیان میں یہ مماثلت نہیں ملتی۔ خرم شفیق کی تحقیق کے مطابق خطبات ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۹ء کے درمیان لکھے گئے تو اقبال نے سنت و حدیث پر اپنا موقف ۱۹۲۶ میں تحریر کرنے سے قبل ہی ۱۹۱۸ء میں کیسے بیان کر دیا تھا سہیل عمر کا یہ دعوی نہایت عجیب اور غلط در غلط ہے۔ کچھ اسی قسم کا موقف سہیل عمر صاحب نے ''خطبات اقبال نئے تناظر'' میں حضرت علامہ اقبالؒ کے اس غلط سلط موقف کی وضاحت میں اختیار کیا ہے جو حدد واللہ کی عالمگیریت کے منافی تھا اسلامی تاریخ میں کسی گمراہ فرقے نے بھی حدود کو زماں و مکاں سے مشروط نہیں کیا۔ اسے ہمیشہ عالمگیر سمجھا گیا لیکن علامہ اقبالؒ نے شبلی نعمانی کی کتاب الکلام سے شاہ ولی اللہ کا محرف حوالہ حرف بہ حرف ترجمہ کر کے خطبات کا حصہ بنایا اور اس محرف حصے کی بنیاد پر یہ دعوی کیا کہ حدود عالمگیر نہیں ہیں یہ ہر زمانے میں بدل سکتی ہیں اور دلیل میں شاہ ولی اللہ کا حوالہ پیش فرمایا[علامہ اقبالؒ کی فاش غلطی کی تفصیلات ساحل ماہ اپریل ۲۰۰۶ء میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔] بعد میں بعض علماء نے اس فاش غلطی پر متوجہ کیا تو سلیمان ندوی صاحب سے خط و کتابت کی سہیل عمر صاحب کے مطابق علامہ اقبالؒ نے اصل کتاب بھی دیکھ لی تھی انہیں شبلی کی تحریف کا بھی اندازہ ہو گیا تھا اور شاہ صاحب کا موقف بھی واضح طور پر ان کے سامنے آ گیا تھا کہ حدود مقامی نہیں لہذا اقبال اس نتیجے پر بھی پہنچ گئے کہ حدود اللہ مقامی نہیں عالمگیر ہیں لیکن سہیل عمر کی تحقیق کے مطابق نہ جانے کیوں اقبال خطبات کی طباعت کے وقت یہ رائے درج نہ کر سکے سہیل عمر صاحب کے ان دو دلائل کی روشنی میں سلیمان ندوی کے موقف کی تائید ہوتی ہے کہ اقبال نے خطبات کے مباحث سے رجوع کر لیا تھا لیکن انھیں اس کے اظہار کا موقع نہیں ملا اگر اقبالؒ کے رجوع کی بات سہیل عمر صاحب بغیر کسی اندرونی و بیرونی شہادت کے بیان کریں تو درست اور سلیمان ندوی اندرونی و بیرونی شہادت کے ساتھ رجوع کا موقف بیان کریں تو غلط یہ عجیب رویہ ہے ساحل صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ اقبال مرد مومن تھے ان سے جو بھی خطائیں سرزد ہوئیں اس کا اندازہ انھیں زندگی میں ہو چکا تھا لہٰذا وہ خطبات کے کفر و الحاد سے منحرف ہو کر رجوع کر چکے تھے لیکن اقبال اکادمی کا اصرار اس بات پر ہے کہ اقبال آخری دم تک الحاد و کفر پر قائم و دائم تھے اور اسی حال میں وہ دنیا سے تشریف لے گئے کیا یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے؟ اقبال اکادمی اقبالؒ کو کس مقام پر فائز کرنا چاہتی ہے جب کہ خود حضرت اقبالؒ نے اپنے بارے میں لکھا تھا کہ واعظ قرآن

بننے کی اہلیت تو مجھ میں نہیں ہے ہاں اس مطالعے سے اپنا اطمینان روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے [ص ۳۷۹ مکاتیب ن ۱۱] اکادمی والے اقبالؒ کو واعظ قرآن ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا اختلاف یہی ہے کہ اکادمی والے اقبالؒ کو طالبِ علمِ دین سمجھیں انھیں واعظ قرآن نہ بنائیں۔

''میارا بزم بر ساحل کہ آنجا'' میں پس واقعہ کے عنوان سے صفحہ ایک پر جناب سہیل عمر کا دعویٰ ہے کہ ''کہانی کہنے والوں کی طرف سے تشکیل جدید کی کفریات کے خلاف تازہ ترین بیان کراچی کے جریدے ساحل کے شمارہ جون ۲۰۰۶ء میں فراہم کیا گیا ہے جواب تک اس مبحث پر سامنے آنے والی سب سے مفصل تحریر ہے''۔

سہیل عمر صاحب کا یہ بیان درست نہیں کیوں کہ حضرت اقبالؒ، ان کے افکار و نظریات اور خطبات میں مستور شوالوں اور الحاد [جس سے حضرت اقبالؒ نے رجوع فرمالیا تھا اور جس کی شہادت استاذ الکل سلیمانؒ ندوی نے مہیا فرمادی ہے] سے متعلق سلسلے ساحل کے مذکورہ شمارے کے مقابلے میں زیادہ تفصیلی مباحث کے ساتھ درج ذیل کتابوں میں موجود ہیں، لیکن اقبال اکادمی نے مصلحت حکمت اور ضرورت کی خوبصورت چلمنوں کے باعث ان کتابوں کو نظر انداز کر دیا اور تمام غصہ کا ہدف ساحل کو بنالیا۔

[ا] ڈاکٹر سلمان رشید کی کتاب *Iqbal Concept of God* اس کتاب میں اقبال کے مذہبی مفکر ہونے کے خیال کو باطل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی اور مغربی فلسفے کے حوالے سے اقبال پر نقد کیا گیا۔

[ب] الدکتور محمد البہی کی کتاب ''الفکر الاسلامی الحدیث وصلتہ بالاستعمار الغربی'' میں صفحہ ۲۲۹ سے ۲۹۵ تک کل چھیاسٹھ صفحات میں اقبال کے فلسفیانہ افکار کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے جس پر تبصرہ کرتے ہوئے اکادمی سے وابستہ ماہر اقبالیات ڈاکٹر وحید عشرت نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ''شعبہ فلسفہ کے محمد البہی اقبال کے اس لیے خلاف تھے کہ اقبال نے خطبہ الہ آباد اور خطبات میں عرب ملوکیت پر جگہ جگہ تنقید کی اور حضرت معاویہؓ کو اس ملوکیت کا ذمہ دار قرار دیا۔ [ص ۱۰۲ میارا بزم بر ساحل کہ آنجا] واضح رہے کہ سعید اکبر آبادی نے ڈاکٹر البہی کے اعتراضات کے ذکر میں علامہ اقبال کی فروگزاشتوں کا اعتراف کیا ہے اور خطبات کے بعض کم زور پہلوؤں کی تاویل بھی کی ہے۔

[ج] ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی غیر مطبوعہ کتاب *Iqbal's Reconstruction* میں اقبال کے الحاد کا جائزہ لیا گیا ہے [اقبال اکادمی کے محقق جناب خصر یاسین کے مضمون کے مطابق جو ''میارا بزم بر ساحل کہ آنجا'' میں شامل ہے] خضر یاسین کے مطابق ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب کی خطبات پر تنقید کے محتویات کا ایک معتد بہ حصہ لفظاً یا معناً ڈاکٹر غلام محمد کے امالی میں آ گیا ہے دونوں میں الفاظ و معانی کی ایسی مشابہت علمی دنیا میں تواردکی نادر مثال ہوگی [ص ۸۳۔۸۴] خضر یاسین کے مطابق سہیل عمر کا ایم فل کا مقالہ ''خطبات اقبال نئے تناظر میں'' ڈاکٹر فاروقی کے اس غیر مطبوعہ تنقیدی مقالے سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے اور سہیل عمر کا یہ لکھنا کہ ان کی کتاب ڈاکٹر برہان فاروقی کے امالی کی حیثیت رکھتی ہے انکسار نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری ہے اور محترم سہیل عمر کی علمی دیانت کا ثبوت [ص ۸۳] اقبال اکادمی نے برہان احمد فاروقی کی اس کتاب پر ابھی تک نقد شائع نہیں کیا۔ اگر برہان احمد فاروقی کا نقد سلیمان ندویؒ نے سرقہ یا چربہ کرلیا ہے تب بھی یہ افکار تو اصلاً برہان احمد فاروقی کے ہوئے لہٰذا تنقید سلیمان ندوی کے بجائے برہان فاروقی اور سہیل عمر پر ہونی چاہیے۔ سہیل عمر صاحب نے لکھا ہے کہ کیا غضب ہے کہ سلیمان ندوی ماجد اور تمام ترقی پسند ایک ہی مورچے سے برآمد ہوتے ہیں۔ اس جملے میں وہ اپنے استاد برہان احمد فاروقی کو کیوں بھول گئے؟

[چ] ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی کتاب قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل'' کے آخری باب کا جواب بھی آج تک

اکادمی نے تحریر نہیں کیا۔

[ح] سہیل عمر کی کتاب ''خطبات اقبال نئے تناظر'' میں خطبات کا پہلا عالمانہ نقد ہے لیکن اس نقد میں اضافے سے گریز کیا گیا اگر یہ نقد وسعت اختیار کرتا تو خطبات اقبال خود رد ہو جاتے۔

[خ] حسین نصر کے مضمون *The Westren World its Chanllenge to Islam* میں اقبال کے رد پر نقد نہیں لکھا گیا۔

[د] ڈاکٹر منظور احمد کی کتاب اقبال شناسی کا جواب بھی اکادمی نے تحریر نہیں کیا۔

[ڈ] جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے فکری حلیف ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی کی کتاب خطبات اقبال ایک مطالعہ'' ۲۷۲ صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب کا بھی جواب اکادمی نے تحریر نہیں کیا۔ کتاب کے مقدمے میں مصنف نے واضح کر دیا ہے کہ ''اقبال اور شیخ محی الدین عربی کے مذکورہ خیالات میں کامل یکسانیت ہے اور دونوں ہی خیالات کفر و شرک کی گندگی سے آلودہ ہیں، خطبات میں کثرت سے ایسے خیالات ملتے ہیں جن پر واضح طور پر کفر و شرک کا اطلاق ہوتا ہے۔ اقبال کی خامی یہ ہے کہ انھوں نے اسلامی افکار کا مطالعہ مغربی فکر کی روشنی میں کیا ہے دوسری خامی مذہبی عقائد کے اثبات کے لیے نصوص قطیعہ پر انحصار نہیں کیا۔ تیسری خامی یہ کہ قرآن مجید کی آیات سے استدلال کرتے وقت ان کے سیاق و سباق کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ آیات کا مطلب کھینچ تان کر نکالا گیا ہے بلکہ بعض مقامات پر دانستہ تحریف کا گمان ہوتا ہے، اس بناء پر ان کے دلائل جن کا تعلق نصوص قرآن سے ہے، ساقط الاعتبار ہیں علامہ کا مطالعہ قرآن زیادہ عمیق نہیں تھا'' [ص ۱۲ تا ۱۶]

کتبوں اور مجسموں میں سجا ہوا اقبال:

[ذ] سہیل عمر کے ممدوح سلیم احمد جن کی یاد میں سہیل عمر صاحب نے اپنے رسالے ''روایت'' کے دو ضخیم نمبر شائع کیے تھے اقبال پر ان کی کتاب ''اقبال ایک شاعر'' کا تنقیدی جائزہ بھی آج تک اکادمی نے پیش نہیں کیا جب کہ اس کتاب میں سلیم احمد نے دعویٰ کیا ہے کہ ''..... یہ سب باتیں ہمیں اقبال کی شخصیت سے اتنا مرعوب کر دیتی ہیں کہ ہم ان پر سوچنے کا کام اقبال اکیڈیمی کے سپرد کر کے رسمی طور پر ان کی تعریف کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں اور ہر سال ایسے مضامین کی تعداد بڑھتی جاتی ہے جن میں چبائے ہوئے نوالوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اگر ہم سنجیدگی کے ساتھ اپنے آپ سے پوچھیں کہ اقبال پر اردو میں کیا لکھا گیا ہے تو جواب شرمندگی کے ساتھ معذرت ہی میں نمودار ہوگا۔ ہم اقبال کی شاعری کو کتبوں میں اور شخصیت کو مجسموں میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ مجسمے بھی وہ جنھیں غیر ملکی سیاحوں کے لیے قومی شاہراہوں پر نصب کر دیا جائے دوسرے لفظوں میں ہم اقبال کو دکھاوے کی چیز سمجھتے ہیں۔ اسی کتاب میں وہ لکھتے ہیں:

میں انھیں عہدِ جدید میں مشرق کی فکری دنیا کا سب سے بڑا آدمی سمجھنے لگا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اقبال اس زمانے میں اسلام کی سب سے مستند آواز ہیں۔ یہ اثر تقریباً پانچ سال قائم رہا۔ اب چالیس سال کے بعد اس زمانے کو یاد کرتا ہوں تو اپنی اس پہلی محبت کا اثر اب بھی اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کرتا ہوں۔ اقبال میرے نزدیک جدید مشرق کے بہت بڑے آدمی پہلے بھی تھے، اب بھی ہیں۔ ان کی شاعری جس طرح پہلے میرے وجود کو ہلا دیتی تھی اب بھی اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ بوڑھا ہو گیا ہوں مگر اقبال کو پڑھتا ہوں تو اب بھی رونے لگتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ بہت بڑی تبدیلی بھی میرے اندر پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے اقبال کے خیالات و افکار سے بہت سے اختلافات پیدا ہو گئے ہیں جن کی نوعیت بنیادی ہے اور میں ان اختلافات کو بیان کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔

بات یہ ہے کہ چھوٹے لوگوں کی غلطیاں نظر انداز کی جا سکتی ہیں کیونکہ ان کا دائرۂ اثر ان ہی کی ذات تک محدود

رہتا ہے یا پھر ایک مختصر سے طبقے میں پھیلتا ہے لیکن اقبال ان لوگوں میں ہیں جن کی ایک چھوٹی سی غلطی بھی پوری قوم کے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔ وہ اتنے بڑے آدمی ہیں کہ ان کی ایک ٹھوکر پوری قوم کو گرانے کے لیے کافی ہوسکتی ہے۔ اس لیے میرے نزدیک فکرِ اقبال کی تنقید پوری ملت کی صحتِ فکر کے لیے ضروری ہے۔ اصل میں یہ کام ہمارے علماء اور صوفیاء کو کرنا چاہیے تھا کیونکہ بہرحال اسلام کے مستند نمائندوں کی حیثیت سے ملت کے عقاید اور افکار کی حفاظت کرنا ان ہی کا کام ہے۔ اقبال سے جن لوگوں نے اختلاف کیا ہے ان میں مولانا اکبرالہ آبادی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، خواجہ حسن نظامی اور مولانا مودودی جیسی جید شخصیتیں شامل ہیں۔ اختلافات کا یہ سلسلہ اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اخبار ''جسارت'' کی رپورٹ کے مطابق مکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور دیگر اساتذہ نے اقبال پر الحاد و زندقہ کے الزام لگائے ہیں اور سفارش کی ہے کہ اقبال کے خطبات کو نوجوانوں تک پہنچنے سے روکا جائے کیونکہ اس سے نئی نسل کے گمراہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ یہ رپورٹ ''جسارت'' میں ''پرستارانِ اقبال کے لیے ایک لمحہ فکریہ'' کے عنوان سے شائع ہوچکی ہے۔ خود اقبال کا حال یہ تھا کہ بقول نذیر نیازی جیسے اقبالی کے، جب انھوں نے اقبال سے خطبات کے بعض مقامات کی وضاحت چاہی تو علامہ یہ کہہ کر بری الذمہ ہوگئے کہ بعض اوقات میری کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ مجھے خود بھی نہیں معلوم ہوتا کہ میں کیا کہہ گیا ہوں۔ شاعری میں خدا کو بخیلی کا طعنہ دینا، ہرجائی کہنا، نیازمند اور گرفتار آرزو کہنا یہ سب تو شاعرانہ باتیں تسلیم کی جاسکتی ہیں لیکن نثر میں محذوب بن جانے کا کیا جواز ہے؟ [ص ۱۲۴ تا ۱۲۵ اقبال ایک شاعر]

لیکن ایک ایسے وقت میں، جب وہ اس طرف توجہ کرتے نظر نہیں آتے، اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود میں اپنے ایمان کا تقاضا سمجھتا ہوں کہ مجھ سے جہاں تک ممکن ہو میں ان باتوں کی نشان دہی کروں جن سے ملت کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔

اقبال سے اپنے فکری اختلافات کا دیانت داری سے اعتراف کرنے کے بعد میں اس ذہنی کیفیت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ''اقبال: ایک شاعر'' کے لکھنے کا محرک بنی۔ اقبال سے مجھے جو اختلافات محسوس ہوئے وہ میرے لیے ایک زلزلے سے کم نہیں۔ ان سے مجھے اتنا شدید صدمہ پہنچا کہ پورا وجود ہل کر رہ گیا۔ یہ ایک ایسے عاشق کا صدمہ تھا جو اسے اس وقت پہنچتا ہے جب اسے اپنے محبوب کے بارے میں وہ حقائق معلوم ہوتے ہیں جو اس کی خوش خیالیوں کو مسمار کردیتے ہیں۔ سطحی اقبال پرست اور اقبال کے نام پر مجاوری اور تجارت کرنے والے لوگ یہ سمجھ بھی نہیں سکتے کہ اقبال کی فکری بنیادوں کو سمجھنے کے بعد میرے قلب و ذہن پہ کیا گزری۔ ظاہر ہے کہ اس کا ایک متوقع نتیجہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ میں ایک سرے سے اقبال کا منکر ہوجاتا لیکن اقبال سے میری محبت نے ایسا نہ ہونے دیا۔ مفکر اقبال میرے ہاتھوں سے نکل گیا مگر شاعر اقبال میرے لیے زیادہ بامعنی ہوگیا۔ ''اقبال: ایک شاعر'' اسی جذبے کے ساتھ لکھی گئی کہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کو بحال کیا جائے۔ یہ کتاب میں نے دوسروں کے لیے نہیں لکھی خود اپنے آپ سے ایک مکالمے کے طور پر لکھی ہے۔ چھپوا اس لیے دی کہ اگر کچھ اور لوگ بھی اس مکالمے میں شریک ہونا چاہتے ہیں تو ہوجائیں۔

''اقبال: ایک شاعر'' کو میں اقبال کے دفاع میں ایک کتاب کہتا ہوں۔ یہ دفاع کسی اور سے نہیں کیا گیا ہے، یہ دفاع میں نے خود اپنے آپ سے کیا ہے۔ میرے شعور میں اقبال سے متعلق جو ہولناک جنگ ہوئی ہے یہ کتاب اس میں میرے شعور کے اس حصے نے لکھوائی ہے جو اقبال سے محبت کرتا ہے، عقیدت رکھتا ہے اور اپنی محبت اور عقیدت کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس محبت کا جواز اسے اقبال کی شاعری میں ملا ہے۔ ''اقبال: ایک شاعر'' میرے لیے اقبال سے محبت کے جواز کا ایک اظہار ہے اور کسی اور کے لیے اس کی کوئی حیثیت ہو یا نہ ہو خود میرے لیے یہ میری ''اقبال پرستی'' کا

سب سے قوی ثبوت ہے۔[ص ۱۲۶]

اس کتاب میں سلیم احمد نے اقبال کی صحت افکار کے ساتھ ساتھ صحت جسمانی کے بارے میں بھی عجیب و غریب اندیشے ظاہر کئے ہیں۔ اس اندیشے کی علمی تحقیق سے اکادمی قاصر رہی جبکہ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان میں اس موضوع کی تحقیق کر لی گئی ہے، اور طبی نسخوں کی پڑتال بھی ہوگئی جو سرہانے سے ملے تھے، لیکن اقبال اکادمی اس پر بھی خاموش رہی۔ سلیم احمد نے تو اقبال کے بارے میں یہاں تک لکھ دیا ''اقبال کی ذاتی زندگی کا علم مجھے نہیں ہے کیونکہ یہ ذاتی زندگی چھپائی گئی ہے''۔

''مجھے اقبال کی ذاتی زندگی کا کم سے کم علم ہے''

میرے اس فقرے پر میرے نقادوں نے بڑی بغلیں بجائی ہیں کہ لیجیے انھوں نے تو خود اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیا ہے۔ پروفیسر ساجد علی جیسے لوگ تو خیر قابلِ معافی ہیں لیکن نظیر صدیقی تک جوش میں آ گئے ہیں۔ لکھتے ہیں: ''اول تو کسی کی ذاتی زندگی کے کم سے کم علم پر نفسیاتی تجزیے کی بنیاد رکھنا ہی خطرناک ہے، پھر اس معاملے میں کم سے کم معاملات کو بہت سمجھنا دلیری سے زیادہ دیدہ دلیری بن جاتا ہے''۔ اب اسے کیا کہیے! یہ لوگ تو کسی بات کا اسلوب بھی نہیں سمجھتے۔ میرے اس فقرے کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ میں نے ''ذکرِ اقبال'' جیسی سوانح عمریاں نہیں پڑھی ہیں یا ان کی زندگی کے بارے میں ان کے دوستوں، مداحوں اور متعلقین کے مضامین کا مطالعہ نہیں کیا ہے یا خود ان کے خطوط میری نظر سے نہیں گزرے۔ دراصل یہ فقرہ ایک طرح کے طنزیہ انکسار سے پیدا ہوا تھا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا: اقبال کی ''ذاتی زندگی کا علم مجھے نہیں ہے کیونکہ یہ ''ذاتی زندگی'' چھپائی گئی ہے۔ ان کے بارے میں ظاہری اور سطحی باتیں بیان کی گئی ہیں بلکہ ان کے انبار لگائے گئے ہیں لیکن جو باتیں حقیقی معنوں میں ذاتی ہیں ان پر پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ ایسی بہت سی باتیں سننے میں آئی ہیں کہ ہر وہ تحریر، جس سے ان کی ذاتی زندگی کے کسی باطنی رخ کا انکشاف ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، اسے ضائع کرنے کی کوششیں ہوتی ہیں۔ خطوط تک اڑا کر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ کتابوں کے مسودے چھپوانے سے رکوا دیے جاتے ہیں۔ غلطی سے ایک آدھ ایسی تحریر چھپ جاتی ہے تو بعد میں اس کی ''خطرناکی'' کا احساس کر کے اسے غائب کر دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اقبال کی ذاتی زندگی کا علم کسی میرے جیسے دور کے آدمی کو کیسے ہو سکتا ہے؟ خدا جانتا ہے کہ مجھے اس بات کا شدید صدمہ ہے کہ ہم نے اقبال کو ایک بت بنانے کی کوشش میں فکر و خیال کی کتنی اہم روشنیوں کو ضائع کر دیا ہے۔[ص ۱۴۲-۱۴۳ اقبال ایک شاعر]

خطوط اقبال کس نے تلف کیے؟ کیوں؟

معاملہ صرف یہی نہیں ہے اس بات کی تحقیق بھی ضروری ہے کہ اقبال اپنے مکاتیب میں لکھتے ہیں کہ وہ سلیمان ندویؒ اور پیر و مرشد اکبر الہ آبادی کے خطوط سنبھال کر احتیاط سے رکھتے ہیں۔ ایما اور عطیہ کے خطوط وہ صندوق میں بند کر کے رکھتے تھے اور ان سے مسلسل استفادہ کرتے رہتے ہیں لیکن انتقال کے بعد تمام خطوط غائب کر دیے جاتے ہیں اور فرزند اقبال جاوید اقبال فرماتے ہیں کہ اقبال تمام خطوط پڑھ کر تلف کر دیا کرتے تھے، ماہر اقبالیات رفیع الدین ہاشمی کی تحقیق یہ ہے کہ اقبالؒ کے انتقال کے بعد یہ تمام کاغذات چوہدری محمد حسین نے سکریٹریٹ کی الماری میں منتقل کر دیئے تھے جب اسے کھولا گیا تو دیمک کاغذات چاٹ چکی تھی۔ تین مختلف بیانات ہیں ان میں کون درست ہے کون غلط اکادمی اس کا تعین کرنے سے قاصر ہے۔ غلط بیانی کون کر رہا ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ یا فرزند اقبالؒ یا چوہدری محمد حسین۔ ''اقبالنامہ'' کی جدید اشاعت میں مختار مسعود نے لکھا ہے کہ اقبالنامہ بازار سے اٹھوا لیا گیا تھا۔ خطوط میں قطع و برید کی گئی تھی، اس کی اشاعت معطل رہی یہ کیوں ہوا؟ کس نے کیا؟ اقبال اکادمی نے اس سلسلے میں کوئی کارروائی کی.....کم از کم ہم لاعلم ہیں۔

[ژ] اقبال اکیڈیمی نے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے اس تبصرے کا بھی جواب نہیں دیا کہ خطبات میں بہت سے ایسے افکار وخیالات بھی ملتے ہیں جن کی تاویل اور اہلسنت کے اجتماعی عقائد سے مطابقت مشکل سے ہی کی جاسکتی ہے یہی احساس استاد محترم سید سلیمان ندویؒ کا تھا''

[ژ] جامعہ ام القریٰ سے ڈاکٹریٹ کا مقالہ محمد اقبال وموقفہ من الحضارۃ الغربیہ.....الدکتور خلیل الرحمان ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا جس کی بنیاد پر عرب علماء نے اقبال کے کفر کے فتوے دیے اور جاوید اقبال کے بقول سعودی عرب میں ایک کانفرنس بھی علماء کی منعقد ہوئی۔ اکادمی نے اس کتاب کے نقد پر بھی توجہ نہیں دی۔

اقبال نے یورپ میں فلسفہ نہیں پڑھا: سہیل عمر

جناب سہیل عمر صاحب نے امالی میں ماجد صاحب کے بارے میں سلیمان ندویؒ کی روایت کا مضحکہ اڑاتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اقبال نے یورپ جا کر مغربی فلسفے کی تعلیم کہاں حاصل کی اسے تو لاہور میں ہی مکمل کر چکے تھے۔ جرمنی سے وہ عربی میں ڈگری لائے تھے مگر امالی کے مطابق مولانا ماجد نے فرض کر لیا کہ اقبال کو عربی نہیں آتی ہوگی اور مغربی فلسفہ پڑھنے یورپ گئے ہوں گے [ص۱۸] آگے چل کر سہیل عمر صاحب نے مہاراجہ کشن پرشاد کے نام اقبال کے خط مورخہ ۱۵/ اپریل ۱۹۱۷ء سے اقبال کی عربی دانی کو ثابت کیا ہے۔ [اقبال کی عربی دانی پر تنقیدات، تنقیحات اور تحقیقات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اقبال عربی زبان سے قطعاً ناواقف تھے، انھوں نے عربی کی تحصیل کی، لیکن اس میں وہ رسوخ حاصل نہیں کر سکے جو علوم اسلامی پر نقد کے لیے لازمی ہے۔ عربی پر عالمانہ محققانہ فاضلانہ عبور کے ذریعے وہ علوم اسلامی میں رسوخ فی العلم حاصل کر سکتے تھے لیکن بوجوہ وہ اس سعادت سے محروم رہے، انھیں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیتیں دی تھیں، اگر اقبالؒ علم تفسیر و حدیث وفقہ سے گہری واقفیت رکھتے تو خطبات کے بین السطور میں بے شمار شوالے نظر نہ آتے، وہ طالب دین تھے عالم دین نہیں تھے، لہٰذا اسلام پر نقد کا حق انھیں حاصل نہیں اور نہ ہی ان کی ''تحقیقات اسلامی'' علماء کے لیے قابل توجہ ہیں، وہ مدرسانہ عربی سے ضرور واقفیت رکھتے تھے، لیکن عالمانہ اور محققانہ عربی سے نہیں اس کی دلیل اقبال کا خط ہے۔ مولوی انشاء اللہ کے نام لکھتے ہیں، ''آخر بہ مجبوری ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس سے باتیں کیں''۔ [ص۵۳ ن ۱۱] نوٹس بورڈ سے میں نے کئی نئے عربی الفاظ سیکھے جن کو ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا لیکن افسوس ہے کہ بعد میں وہ کاغذ بھی کھو گیا [ص ۶۶، ن ۱۱] یہ عبارتیں ۱۹۰۵ء کی ہیں اور اقبال اس سے قبل اورینٹل کالج میں مہر صاحب کی شہادت کے مطابق ''عربی کے پروفیسر رہ چکے تھے''۔ اقبال عربی کی شد بُد رکھتے تھے اور عام عربی کتابوں سے اخذ واستفادہ کی صلاحیت رکھتے ہوں گے لیکن عربی کی امہات کتب سے نہ اخذ و استفادہ کر سکتے تھے نہ نقد ومحاکمہ ''اقبالؒ'' کی کتاب تاریخ تصوف کے مرتب صابر کلوروی کی شہادت ہے کہ ''عربی پر قدرت کاملہ نہ رکھنے کی وجہ سے اقبال نے فارسی ترجمہ پر بھروسہ کیا جس سے وہ حلاج کی حقیقت کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکے۔ [تاریخ تصوف اشاعت اول مکتبہ تعمیر انسانیت، ص۲۷] اس کتاب کا انتساب ماہرین اقبالیات ایوب صابر، قاسم محمود اور رفیع الدین ہاشمی کے نام ہے۔ دیباچہ جاوید اقبال کے قلم سے ان نامور اقبالئین نے ۱۹۸۸ء سے آج تک صابر کلوروی پر تنقید نہیں کی۔ ساحل پر تنقید کے لیے خم ٹھونک کر کھڑے ہو گئے۔ اس سلسلے میں تفصیلات کے لئے ساحل کے زیر نظر شمارے کے صفحات ۶۸ اور ۶۹ کا مطالعہ ضروری ہے جہاں اقبال کے ان دو خطوط کا محاکمہ کیا گیا ہے جو ایک ہی تاریخ کو دو مختلف شخصیات کے نام ایک ہی موضوع پر لیکن دو مختلف لہجوں میں لکھے گئے۔ ہمارا موقف صرف یہ ہے کہ اقبال نہ علوم عربیہ میں رسوخ رکھتے تھے نہ علوم اسلامیہ میں لہٰذا وہ علم کلام علم حدیث علم تفسیر علم فقہ کے مباحث میں دخل اندازی کے اصلاً اہل ہی نہ تھے یہ درست ہے کہ وہ ایک عبقری شخص تھے لہٰذا ان کے سوالات نہایت اہم ہیں لیکن ان سوالات کی بنیاد پر انہیں امام غزالیؒ کے برابر درجہ نہیں دیا

جاسکتا افسوس یہ ہے کہ اقبالؒ کا خود خیال یہی تھا کہ انھوں نے خطبات لکھ کر امام غزالیؒ سے بھی بڑا کام کیا ہے اس سلسلے میں حمزہ فاروقی کی مرتبہ کتاب ''حیات اقبال کے چند مخفی گوشے'' کا صفحہ ۶۹ سے ۸۳ تک کا مطالعہ کرلیا جائے خطبات کے تعارف اور تعریف میں لکھا گیا کہ یہ مضمون اقبال کے ایماء اور منشا سے شائع ہوا[ص ۶۹] اس مضمون میں یہ لکھوایا گیا کہ اس کتاب کو احیاء العلوم پر ترجیح حاصل ہے عقائد کے وہ صحیح دلائل دنیا کے سامنے پہلی بار پیش کئے گئے ہیں جو قرآن میں موجود تھے لیکن جن کو حکمائے اسلام آج تک سمجھ نہ سکے عقلیات حقہ اور وحی الٰہی کو متحد و ہم جنس ثابت کرنے کی سعادت ساڑھے تیرہ سو سال میں صرف اقبال ہی کو نصیب ہوئی ہے اور بہت ممکن ہے کہ دنیا میں آج تک کسی کو نصیب نہ ہوئی ہو وحی اور سائنس کا واحد منبع سے پیدا ہونا خود سائنس کے ذریعے ہی ثابت ہوجائے گا اقبال کا یہ کارنامہ امام غزالیؒ کے کارنامے سے بڑھ کر سمجھا جائے گا'' اقبال کے ایماء پر لکھی گئی یہ تحریر صرف ایک صدی بعد اپنی حقیقت خود کھو چکی ہے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں دوسرے یہ کہ جب اقبال کا رجوع ثابت ہوگیا ہے تو تبصرے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔

عربی سے ناواقفیت عیب نہیں: شاطبیؒ

اقبال اور عربی کی بحث سے بعض احباب کے ذہن میں جو خلجان پیدا ہورہے ہیں اس کے ازالے کے لئے ہم امام شاطبی کی کتاب الموافقات ج۴ ص۸۰ سے ایک اقتباس درج کرتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عربی زبان سے ناواقف شخص بھی ترجمے کے ذریعے شرع کے مقاصد سمجھ سکتا ہے۔ ''عربی زبان کے علم کے شرط نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ عربی کا جاننا محض الفاظ کے ان مقتضیات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جو کہ شرعی الفاظ سے سمجھے جاتے ہیں شارع کے الفاظ جو ان مقتضیات کی طرف رہنمائی کرتے ہیں عربی زبان میں ہیں چنانچہ ایسا شخص جس کی زبان عربی نہیں اس کے لئے عربوں کی زبان سمجھنا ممکن نہیں بالکل اسی طرح جیسے عربی اور بربری میں باہمی فہم کا رابطہ نہیں یا رومی اور عبرانی میں رابطہ نہیں ہوسکتا جب تک ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کی زبان کے مقتضیات سے آگاہ نہ ہو البتہ جہاں تک مجرد معانی کا تعلق ہے ان کے سمجھنے میں تمام ذی عقل برابر ہیں یہ بات کسی ایک زبان سے اس طرح مخصوص نہیں کہ دوسری زبان میں یہ ممکن نہ ہو، چنانچہ جو شخص احکام کے نزول سے شرع کے مقاصد سمجھ جاتا ہے چاہے وہ ان احکام کے کسی غیر عربی زبان میں ترجمہ کے طریقہ سے سمجھا ہو تو اس میں اور اس شخص میں جس نے عربی زبان کے ذریعے سمجھا ہو کوئی فرق نہیں۔ [شاطبیؒ الموافقات، ج۴، ص۸۰][لیکن اس عبارت کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ مقاصد شرع سمجھنے کے بعد علامہ اقبال کی طرح مجتہد مطلق کے منصب پر فائز ہوجائے اور قرآن سنت وفقہ تفسیر حدیث کے مہمات مسائل میں صرف ترجموں پر انحصار کرکے اپنی رائے دینے لگے بلکہ اس مقام سے آگے بڑھ کر ایسے دعوے بھی کرنے لگے جن کی جرأت اسلامی تاریخ میں کسی بڑے سے بڑے صاحب تفرد، برخود غلط علماء، اور متجددین کو بھی نہ ہوسکی]۔ اقبال کی عربی دانی کے ضمن میں خرم صاحب کے کل دلائل درج ذیل ہیں:

[۱] اقبال کی پہلی ملازمت اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر ہی کے طور پر شروع ہوئی تھی۔

[۲] میونخ یونیورسٹی نے بھی اقبال کو فلسفے کے شعبے میں نہیں بلکہ عربی کے کھاتے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی۔

[۳] اقبال لندن یونیورسٹی میں چھ ماہ کے لیے عربی کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔

[۴] یورپ میں تحقیق کا موضوع بھی ایرانی مابعد الطبیعیات تھا جس کا غالب حصہ اسلامی علوم ہی پر مشتمل تھا۔

خرم شفیق کے دلائل کی روشنی میں درج ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:

[۱] کیا اقبال نے عربی میں میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی؟

[۲] کیا اقبال نے کیمبرج سے عربی میں بی اے کیا اور عربی لغت ادب یا شاعری پر مقالہ ڈاکٹر میکٹیگرٹ کی نگرانی میں مکمل کیا؟

[۳] کیا کیمبرج میں اقبال کے مقالے ایرانی مابعد الطبیعیات کا تعلق عربی ادبیات سے تھا یا فلسفے سے؟

[۴] کیا اقبال کے مقالے کے نگراں میکلیگرٹ عربی کے پروفیسر تھے یا فلسفے کے۔

[۵] کیا اقبال نے میونخ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے داخلے کی درخواست شعبۂ فلسفہ میں داخل کی تھی یا شعبۂ عربی میں وہ پی ایچ ڈی کی سند عربی میں حاصل کرنا چاہتے تھے یا فلسفہ میں؟

[۶] کیا اقبال کو میونخ یونیورسٹی نے جبراً شعبۂ عربی میں داخلہ دیا تھا یا اقبال کی خواہش تھی کہ وہ عربی میں داخلہ لیں؟

[۷] کیا اقبال نے اپنا مقالہ عربی میں لکھا تھا، عربی ادبیات ولسانیات پر تحریر کیا تھا اور کیا مقالے کی زبان جرمن تھی؟

[۸] اقبال کی پہلی ملازمت بحیثیت میکلوڈ عربک ریڈر اورینٹل کالج میں ہوئی تو اقبالؒ وہاں طلباء کو عربی پڑھاتے تھے یا کچھ اور پڑھایا کرتے تھے؟

[۹] کیا اقبال کو فی الواقع لندن یونیورسٹی میں چھ ماہ کے لیے بحیثیت پروفیسر عربی ملازمت دی گئی یا یہ ملازمت صرف تین ماہ کے لیے تھی، یا یہ رضا کارانہ کام تھا کیا ان کو اس عہدے کا تقرر نامہ جاری کیا گیا تھا۔ اس تقرری کا کوئی دستاویزی ثبوت؟

[۱۰] کیا اقبال نے کیمبرج میں فلسفے کی تعلیم حاصل نہیں کی؟

[۱۱] کیا اقبال نے لاہور سے فلسفے کی تعلیم اعلیٰ نمبروں سے حاصل کی تھی؟ کیا اقبال نے غلام رسول مہر کی روایت کے مطابق ایم اے فلسفے میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی تھی؟

[۱۲] کیا اقبال نے عربی میں کوئی کتاب لکھی یا ان کے مضامین یا خطبات میں یا خطوط میں عربی لغات لسانیات کے حوالے سے تحقیقات دستیاب ہیں؟

ان سوالات کے مستند جوابات کی روشنی میں ہی خرم علی شفیق صاحب کے دعوے کی تردید یا تائید ممکن ہے جو سہیل عمر صاحب کی علمی رہنمائی میں کیا گیا ہے۔ ان سوالات کے مختصر جوابات درج ذیل ہیں:

[۱] علامہ اقبال نے میونخ یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفے سے پی ایچ ڈی کے حصول کے لیے داخلے کی درخواست جمع کرائی لیکن بعض تیکنیکی مجبوریوں کی بناء پر میونخ یونیورسٹی نے انھیں شعبہ فلسفہ کے بجائے شعبۂ عربی میں داخلہ دیا۔ *Iqbal an illustrated biography* اقبال اکادمی کی یہ کتاب خرم علی شفیق صاحب نے مرتب کی ہے لیکن بہ ظاہر ساحل پر تنقید کرتے ہوئے وہ اپنی مرتبہ کتاب کے بین السطور کو فراموش کر بیٹھے، حالانکہ امر واقعہ یہ نہیں ہے ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ خرم علی شفیق صاحب کے نام سے لکھا گیا کڑوا کسیلا اور زہریلا نقد اصلاً سہیل عمر صاحب کا ہے۔ اس لیے یہ سہو ہو گیا کیونکہ خرم شفیق کی تحریریں کاٹ، غصہ، طنز وتعریض سے عاری ہوتی ہیں، یہ اسلوب سہیل عمر صاحب سے مخصوص ہے اس کا ثبوت روایت کا وہ شمارہ ہے جس میں محمد ارشاد پر نقد کرتے ہوئے سہیل عمر نے اپنے مضمون کا عنوان ''مار و گھٹنا پھوٹے آنکھ'' منتخب کیا تھا۔ یہ اسلوب علمی وقار کے منافی ہے، خرم علی شفیق کے نام سے لکھی گئی تحریر دشنام واتہام کا شاہکار ہے۔ مرتب امالی کو پروفیسر لکیر الدین فقیر تک لکھا گیا ہے، اس کے ذہن کو شر پسند قرار دیا گیا ہے اور ہر نثر پارے کے اختتام پر طنز واستہزا کے ترکش خالی کیے گئے ہیں اس لیے ہم خرم شفیق کو نظر انداز کر کے سہیل عمر صاحب سے مخاطب ہیں]

[۲] اقبال نے کیمبرج سے بی اے کا امتحان دیا اور پروفیسر میکلیگرٹ کی نگرانی میں *The Development of Metaphysic in Persia* کے عنوان سے تحقیقی مقالہ تحریر کیا ''مابعد الطبیعیات'' کا تعلق عربی سے نہیں فلسفے سے ہے۔

ٹرینٹی کالج میں اقبال نے پروفیسر میکٹیگرٹ کی نگرانی میں انگریزی زبان میں یہ مقالہ مکمل کیا، اس مقالے کا عربی ادبیات لغات لسانیات وغیرہ سے براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ کیمبرج میں بی اے کی تعلیم میں اقبال نے انگریزی، عربی اور فلسفے کے مضامین کا مطالعہ کیا تھا۔ اس مقالے کے پانچویں باب ''صوفی ازم'' کے لیے علامہ اقبالؒ نے خواجہ حسن نظامیؒ سے لوازمہ طلب فرمایا لیکن اپنے خط میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا اس رویے کی کیا توجیہہ کی جائے یہ ہم اقبال اکادمی پر چھوڑتے ہیں ۸ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو ٹرینٹی کالج کیمبرج سے خط میں لکھتے ہیں۔

از کیمبرج، ٹرینٹی کالج

۸۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء

اسرارِ قدیم، سیّد حسن نظامی!

ایک خط اس سے پہلے ارسال کر چکا ہوں، امّید کہ پہنچ کر ملاحظۂ عالی سے گزرا ہوگا۔

اس خط کے جواب کا انتظار ہے اور بڑی شدّت کے ساتھ۔ اب ایک اور تکلیف دیتا ہوں، اور وہ یہ کہ قرآن شریف میں جس قدر آیات صریحاً تصوّف کے متعلق ہوں اُن کا پتہ دیجیے۔ سپارہ اور رکوع کا پتہ لکھیے۔ اس بارہ میں آپ قاری شاہ سلیمان صاحب یا کسی اور صاحب سے مشورہ کر کے مجھ بہت جلد مفصل جواب دیں۔ اس مضمون کی سخت ضرورت ہے، اور یہ گویا آپ کا کام ہے۔

قاری شاہ سلیمان صاحب کی خدمت میں میرا یہی خط بھیج دیجیے اور بعد التماس دُعا عرض کیجیے کہ میرے لئے یہ زحمت گوارا کریں اور مہربانی کر کے مطلوبہ قرآنی آیات کا پتہ دیویں۔

اگر قاری صاحب موصوف کو یہ ثابت کرنا ہو کہ مسئلہ وحدۃ الوجُود یعنی تصوّف کا اصل مسئلہ قرآن کی آیات سے نکلتا ہے تو وہ کون کون سی آیات پیش کر سکتے ہیں اور ان کی کیا تفسیر کرتے ہیں۔

کیا وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ تاریخی طور پر اسلام کو تصوّف سے تعلق ہے؟ کیا حضرت علی مرتضےٰؓ کو کوئی خاص پوشیدہ تعلیم دی گئی تھی؟ غرضکہ اس امر کا جواب معقولی، منقولی اور تاریخی طور پر مفصل چاہتا ہوں۔ میرے پاس کچھ ذخیرہ اس امر کے متعلق موجود ہے مگر آپ سے اور قاری صاحب سے استصواب ضروری ہے۔ آپ اپنے کسی اور صوفی دوست سے بھی مشورہ کر سکتے ہیں، مگر جواب جلد آئے باقی خیریت ہے۔ [۶۰۵، ۶۰۶، اقبالنامہ، ن ۱۱]

[۳] کیمبرج میں اقبال کے تحقیقی مقالے کا تعلق عربی ادبیات سے نہیں مابعد الطبیعیات سے تھا جو فلسفے کا موضوع ہے۔ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل تھا:

[A] Persian Dualism [B] Neo Platonic Aristotelians of Persia [C] Islamic Rationalism [D] Controversy Between Realism and Idealism [E] Sufiism [F] Late Persian Thought

اس مقالے کا ہر باب فلسفے سے تعلق رکھتا ہے، اسے عربی زبان وادب وادبیات ولسانیات سے کسی طور پر منسلک نہیں کیا جا سکتا۔ آخری باب میں ملا صدرہ اور بہاء اللہ کے افکار کا جائزہ لیا گیا ہے جو فلسفے سے تعلق رکھتے ہیں عربی ادبیات سے نہیں۔

[۴] اقبال کے مقالے کے نگران ڈاکٹر میکٹیگرٹ فلسفی تھے اور کیمبرج میں فلسفے کے پروفیسر تھے۔ [اقبال کی تصویری سوانح خرم علی شفیق] پروفیسر میکٹیگرٹ پر علامہ اقبال کا وہ مقالہ جو انڈین سوسائٹی جرنل میں شائع ہوا تھا اگر دیکھ لیا

جائے تو بہت سی گرہیں کھل جائیں گی۔

[۵] اقبال نے میونخ یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ میں پی ایچ ڈی کے داخلے کے لیے درخواست جمع کرائی تھی۔ شعبۂ عربی میں نہیں کیونکہ ان کی دلچسپی فلسفے سے تھی عربی ادبیات سے نہیں۔ کیونکہ میونخ یونیورسٹی میں عجمی فلسفے کا کوئی ماہر موجود نہ تھا، لہٰذا اقبال کو ہدایت کی گئی کہ وہ فلسفہ کے بجائے عربی میں داخلہ لیں، انگریزی اور فلسفہ کو فرعی مضامین قرار دیا گیا اور فلسفہ میں اقبالؒ کو درجہ سوم عطا کیا گیا۔ مقالے کے ممتحن ڈاکٹر کوہن سنسکرت زبان کے ماہر تھے، دوسرے ممتحن پروفیسر پلس فلسفی تھے، زبانی امتحان بھی انگریزی میں لیا گیا اور پروفیسر شک [Schick] نے یہ امتحان لیا۔ پروفیسر ہومل بھی شریک تھے، مقالے کے ساتھ ممتحنوں نے بڑا لحاظ کیا تھا کیونکہ جرمنی میں فلسفہ عجم کا ماہر دستیاب نہ تھا، لہٰذا عربی اور انگریزی لسانیات کے ماہرین کو ہی بطور ممتحن لگا دیا گیا کہ پی ایچ ڈی عطا کی جا سکے۔ اس تمام کارروائی میں مرکزی کردار پروفیسر آرنلڈ کے خط نے ادا کیا اور اسی پر یونیورسٹی نے انحصار کیا۔ اقبال کے مقالے فلسفہ عجم کے نگراں کیمبرج میں ڈاکٹر میک ٹیگرٹ تھے جو ہیگلین فلسفے کے ماہر تھے اور عجمی فلسفے سے ناواقف تھے۔ عجمی اسلامی فلسفے پر یونانی اثرات کی چھان بین کا کام خود اقبال نے انجام دیا تھا۔ اس سلسلے میں نگران ان کی مدد سے قاصر تھا۔ [مقالے کی انہی کمزوریوں کے باعث اقبال نے پروفیسر میر ولی الدین کو ترجمے سے گریز کا مشورہ دیا تھا، اس مقالے کی کمزوریاں اور خامیاں اقبال پر بخوبی عیاں تھیں لہٰذا اسے کبھی اپنے علمی کارنامے کے طور پر اقبال نے پیش نہیں کیا] ۱۹۰۸ء میں اس مقالے کی اشاعت کے انتساب میں اقبالؒ نے لکھا ہے کہ یہ چھوٹی سی کتاب اس ادبی اور فلسفیانہ ترتیب کا میوہ بخشیں ہے جو میں گزشتہ دس برس سے آرنلڈ سے پا رہا ہوں'' یہاں فلسفیانہ ترتیب کا ذکر ہے۔ عربی ادبیات کے فیض کا نہیں۔ اقبال کے موضوع مقالہ کی منظوری دینے والوں میں پروفیسر سور لے شامل تھے جو فلسفے کے پروفیسر تھے۔

[۶] تیکنیکی مجبوریوں کی بناء پر میونخ یونیورسٹی نے اقبال کو شعبۂ عربی میں داخلہ دیا۔

[۷] اقبال نہ عربی زبان پر عبور رکھتے تھے نہ جرمن زبان پر لہٰذا انھیں پروفیسر نکلسن کی سفارش پر انگریزی میں مقالہ جمع کرانے کی خصوصی اجازت دی گئی لیکن مقالے کے زبانی امتحان کے لیے جرمن زبان کی شرط برقرار رکھی گئی۔ لہٰذا علامہ اقبال نے جرمن زبان کی شد بد حاصل کی۔ غالباً ایما ویگے ناست سے اقبالؒ نے جرمن زبان سیکھی جرمنی میں قیام کے دوران ایما کی روزانہ علامہ اقبال سے ملاقات رہتی تھی ان کی شخصیت پر ایما کے گہرے اثرات تھے اصلاً ایمانرس تھیں فلسفے سے ان کا تعلق نہ تھا اقبال نے ایک خط میں ایما کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں جرمن زبان بھول گیا ہوں صرف ایک لفظ ''ایما'' یاد ہے''۔ [دوسری روایت کے مطابق اقبال کا زبانی امتحان انگریزی میں لیا گیا۔] ڈاکٹر حمید اللہؒ پیرس کی شہادت ہے ''اقبال کی عربی سے ناواقفیت دیکھ کر حیرت ہوئی یہی حال جرمن دانی کا ہے [ڈاکٹر حمید اللہ راشد شیخ ص ۱۴۷ اہل فرنگ کی اقبالؒ سے دلچسپی کے بارے میں ص ۴۷۲ کا مطالعہ کیا جائے]

[۸] اقبال کی پہلی ملازمت بحیثیت میکلوڈ عربک ریڈر اورینٹل کالج میں ہوئی تھی لیکن اقبال وہاں طلباء کو عربی زبان پڑھانے پر مامور نہیں کیے گئے تھے بلکہ وہ طلباء کو تاریخ اور سیاسی معیشت پڑھاتے تھے۔ اقبال نے پی ایچ ڈی کے مقالے کے تعارف میں "LE BENLAUF" کے زیر عنوان اپنے قلم سے اپنے بارے میں تحریر کیا ہے کہ:

I was appointed Mc Load Arabic Reader in the oriental college where I lectured on history and political Economy for about 3 years. I was then appointed Assistant Professor of Philosophy in Lahore Government College.

حیرت کی بات یہ ہے کہ تجربہ، تدریس عربی کا تھا اور ترقی فلسفے کے استاد کی حیثیت سے دی گئی۔ سہیل عمر صاحب اس تضاد کی کیا توجیہہ پیش کر سکتے ہیں؟ لندن سے واپسی پر اقبال کو گورنمنٹ کالج میں فلسفے کے پروفیسر کا عہدہ

دیا گیا اور علامہ اقبال کے خط کے مطابق گورنر کی ہدایت پر ہائیکورٹ کو حکم دیا گیا کہ اقبال کے مقدمات کی سماعت صبح کے وقت نہ کی جائے کیونکہ گورنمنٹ کالج میں وہ صبح تدریس میں مصروف ہوتے ہیں علی گڑھ سے انھیں فلسفے کے پروفیسر کے عہدے کی پیش کش کی گئی عربی کے پروفیسر کی نہیں۔

[۹] خرم علی شفیق صاحب کی مرتبہ کتاب ''اقبال کی تصویری سوانح کے مطابق پروفیسر نکلسن کی چھ ماہ رخصت کے دوران اقبال بحیثیت لکچرر عربی لندن یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے جب کہ اقبال نے کش پرشاد کے نام خط میں دعویٰ کیا ہے کہ وہ پروفیسر عربی کی حیثیت سے چھ ماہ تک لندن یونیورسٹی میں خدمات انجام دیتے رہے۔[ڈاکٹر درانی کی تحقیق کے مطابق صرف تین ماہ اقبال نے تدریس کے فرائض انجام دیئے] اقبال اکادمی کے پاس اس تضاد کی توجیہہ وتاویل کے سلسلے میں اگر دستاویزات ہوں تو وہ پیش کردیں یا کم از کم خرم شفیق کو مطلع فرمادیں۔ظاہر ہے تینوں بیانات بیک وقت درست نہیں ہوسکتے۔

[۱۰] اقبال نے کیمبرج میں اصلاً فلسفے کی تعلیم حاصل کی، ان کے تمام فلسفیانہ خیالات کی تشکیل کیمبرج میں ہوئی۔ [اقبال کیمبرج میں فلسفے کے ساتھ ساتھ معاشیات کا مطالعہ کرتے تھے، روزگار فقیر، جلد۲، ص۹۳] اقبال نے کیمبرج میں معاشیات کے مطالعے کے علاوہ فلسفے میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ چھ ماہ تک استاد عربی کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں آرنلڈ کی جانشینی کے فرائض انجام دیے۔شذرات فکر اقبال ص ۷ مرتبہ جاوید اقبال اقبال خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں فلسفہ بوڑھا بنا دیتا ہے شاعری تجدید شباب کرتی ہے۔[ص ۱۵۹، ش ف ا]Stray میں اقبال نے ہیگل، ارسطو، اسپنوزا، افلاطون، نطشے، کانٹ، ونڈ، وارڈ، جیمز، اسٹاوٹ کے حوالے دیے، کسی اسلامی فلسفی کا حوالہ نہیں دیا۔ گوئٹے، غالب، بیدل وڈزورتھ ملٹن آسکر وائلڈ موریس مانٹین ہائنے، حافظ اور ابوتمام کے حماسہ کا حوالہ دیا ہے اس کے سوا عربی ادبیات پر کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ ہیگل اور گوئٹے اقبال کے فکری رہنما ہیں۔[ص ۲۵، شذرات فکر اقبال] اقبال کیمبرج میں تین سال رہے انھوں نے کیمبرج میں جیمس وارڈ، ولیم سوچی سورلے اور جان میکٹیگرٹ سے استفادہ کیا، یہ تینوں کیمبرج میں فلسفے کے پروفیسر تھے اور تینوں آئیڈیلسیٹ فلسفے کے پرچارک تھے۔

ان تینوں اساتذہ کے اسباق اور سیمینار میں اقبال نے شرکت کی ان تینوں اساتذہ کے اثرات کے تحت خطبات لکھے گئے خطبات پر ان تینوں اساتذہ کی گہری پرچھائیں ہے بلکہ بعض محققین [خصوصاً سلیمان ندوی کی تحقیقات کی روشنی میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے یہ افادات احمد جاوید صاحب کی نظر ثانی کے بعد جلد شائع ہورہے ہیں] کے مطابق اقبال کے خطبات جیمس وارڈ سورلے اور میکٹیگرٹ کے افکار، خیالات کا سرقہ اور چربہ ان معنوں میں ہیں کہ اقبال نے بیسویں صدی کی پہلی دہائی کی انگلستانی فلسفیانہ فکر کو ان تین افراد کے زیر اثر خطبات میں فکر اسلامی کا لبادہ پہنا دیا۔اس زمانے میں ہیگل کے افکار مسترد ہوچکے تھے لیکن میکٹیگرٹ وغیرہ ہیگل سے بہت متاثر تھے لہٰذا اقبال پر ہیگل کا بے حد اثر تھا وہ ہیگل سے بے حد متاثر تھے۔ برگساں کا بھی خاص اثر تھا جبکہ اس کا فلسفہ بھی مغرب میں رد ہوچکا تھا اقبال مسترد شدہ فلسفہ مغرب کے ضمیر سے خطبات کا خمیر تیار کررہے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ جس زمانے میں وہ خطبات لکھ رہے تھے فلسفے میں پیدا ہونے والے نئے مکاتب فکر سے ناواقف تھے علامہ عرشی کے نام خط میں وہ اعتراف کرتے ہیں کہ مدت سے وہ قرآن اور مثنوی کے سوا کوئی کتاب نہیں پڑھتے اسی لئے خطبات اقبال میں ہزرل، ہائیڈیگر ونگنسٹائن کا حوالہ نہیں ملتا جبکہ ان فلسفیوں کے افکار آج تک مغربی فکر فلسفے پر اثر انداز ہیں اقبال اس عہد کے Analytical philosphy Existensialism اور Phenomonology سے بھی ناواقف تھے جبکہ یہ فلسفے اس عہد کے منظر نامے پر چھا چکے تھے۔لیکن اقبال نے ہیگل

برگساں اور اپنے تینوں اساتذہ کے مسترد متروک فلسفے پر خطبات کا عظیم الشان محل تعمیر کیا ایک ناقد کے بقول ''اقبال خطبات میں یونانی فکر کے صغریٰ کبریٰ کے طلسمی پنجرے سے باہر نہ نکل سکے وہ آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیت پر بھی گہری نظر نہیں رکھتے تھے اور اس کے بارے میں بہت سرسری معلومات رکھتے تھے''۔خطبات کو اقبال کا فلسفہ بھی نہیں کہا جاسکتا بلکہ خطبات Eclecticism کا شاہکار ہے ادھر ادھر کے حوالے مختلف مناہج کے فلسفے ایک دوسرے میں پیوست اور مدغم کر کے عجیب وغریب نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہر فلسفی کا اپنا منہاج ہوتا ہے یا وہ کسی خاص منہاج کو اختیار کر کے اس میں توسیع ترمیم اضافہ کرتا ہے لیکن خطبات کا کوئی منہاج نہیں اقبال کے مداحوں اور غلام رسول مہر اور خود حضرت اقبالؒ کا خیال تھا کہ خطبات اور اقبال کا مرتبہ غزالیؒ سے بڑھ کر ہے اور خطبات مغرب پر اسلام کا دروازہ کھول دیں گے لیکن مغرب میں خطبات کو اسلام کے شارح کی حیثیت سے علمی وعملی سطح پر کسی نے بھی قبول نہیں کیا اور مشرق میں خطبات کے معتزلی شہسوار کو خود اقبالؒ کی شاعری اور شخصیت نے رد کر دیا لہٰذا خطبات کو فلسفہ کہنا بہت مشکل ہے مختلف فلاسفہ کے افکار کا آمیزہ آمیختہ اور مرکب تو کہا جاسکتا ہے جس سے ہر شخص کچھ بھی نتیجہ اخذ کر سکتا ہے افسوس یہ ہے کہ خطبات پڑھ کر مغرب میں ایک بھی شخص مسلمان نہیں ہوا اور مشرق میں خطبات کے بہت سے مقامات معرفت وکشف نہ پروفیسر کرار حسین سمجھ سکے نہ جاوید اقبال کی گرفت میں آسکے نہ نذیر نیازی ان مقامات کا مطلب سمجھ سکے، اب اسے کون سمجھ سکے گا؟ جناب سہیل عمر کا موقف ہے کہ خطبات کا کوئی اردو ترجمہ کامل نہیں حتی کہ نذیر نیازی کا ترجمہ بھی مقالات مضامین وخطوط کے تراجم بھی غیر معتبر ہیں حتی کہ اکادمی کا نسخہ بھی مولانا ظفر علی خان، پروفیسر عطاء، اللہ شیرانی سب کے ترجمے غیر معتبر ہیں اور اقبال اکادمی معتبر تراجم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔

خدا خودی زمان مکان، مذہب تصوف فلسفہ کے اہم موضوعات ہیں۔اقبال نے جو فلسفہ میں تصوریت کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں، ان مباحث پر گفتگو کر کے جدید علم کلام کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی، لیکن یہ جدید علم کلام ہیگل اور مغربی فلاسفہ سے اخذ شدہ ہے اور مغرب میں مسترد شدہ فلسفہ ——— جس زمانے میں اقبال مغرب سے فلسفے کی تعلیم حاصل کر کے تشریف لا چکے تھے اسی زمانے میں ہیگل کے رد میں مغرب میں جو کچھ لکھا جارہا تھا اقبال اس سے قطعاً ناواقف تھے۔اقبال کی نظر میں قرآن کا اصلی مقصد انسان میں خدا اور کائنات سے تہہ در تہہ اضافتوں [رشتوں] کا اعلیٰ شعور بیدار کرنا ہے۔اس تعلق کو سمجھے بغیر ان میں سے کسی تصور پر بامعنی گفتگو ممکن نہیں۔کائنات خدا کا تخلیقی لہو ولعب نہیں یہ ہر دم تخلیقی مراحل طے کر رہی ہے، اس کے باطن میں نئی تخلیقات کے خواب پوشیدہ ہیں، انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ کائنات کو مکمل طور پر مسخر کرے، انسان کی زندگی کی ایک ابتداء ضرور ہے، لیکن انتہا لامحدود ہے، تجربے کی غیر حسی سطح اقبال کی نظر میں وقوفی تجربہ ہے [وجدان یا مذہبی تجربہ] فکر ایک درونی قوت ہے جو مادہ [امکان] کو وجود عطا کرتی ہے۔فلسفیانہ فکر نے وجود وفکر کے درمیان جو تفریق رکھی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔یہ دونوں بنیادی طور پر ایک ہیں۔اقبال کا یہ استدلال ہیگل کے فلسفہ سے ماخوذ ہے، اس کے لیے برکلے وہائٹ ہیڈ رسل وبرگساں سے بھی سہارا واسناد لیا گیا ہے جب کہ یہ فلاسفہ اس مسئلے کی تفہیم میں مدد ہونے کے بجائے رکاوٹ ڈالتے ہیں۔اقبال شعور کے تشخص کو خودی کہتے ہیں جو شعوری حالتوں کی وحدت کا نام ہے۔حقیقی زمانہ یا مرور صرف خودی کی شان ہے، خودی کی وحدت کا خصوصی پہلو فردیت ہے جب تک واقعہ، حکم احساس میرے تجربے کا جزو نہ بنے میرے لیے بے معنی ہے۔خدا خود میری جگہ محسوس کر سکتا ہے نہ حکم لگا سکتا ہے اور نہ مختلف راستوں میں کسی راستے کا انتخاب کر سکتا ہے یہ سب کام میری خودی سے متعلق ہیں اور میرا ذاتی استحقاق ——— یہی متشخص منفرد قوت محرکہ ''میں''، ''خودی''، ''ذات'' یا ''انا'' ہے۔یہی میرے وجود کی حقیقت ہے۔ارتقاء کے مرحلے میں خودی ایک آزاد عمل کا نام ہے جس کا راستہ خود ذات متعین کرتی ہے ..... یہی خدا کی ماہیت ہے، خدا بھی ایک فرد ہے ایک خودی ہے جو انسانی خودی کے

مقابلے میں اسی طرح ارفع واعلیٰ ہے جس طرح انسانی خودی کم تر درجہ کی ذات کے مقابلے میں اقبال کے اس فلسفے کو تسلیم کرنے سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے وہ یہ کہ ''ہم خدا کو لامحدود'' کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ اقبال کا جواب ہے خدا کی لامحدودیت مکانی نہیں ہے بلکہ درونی ہے اور یہ ان لامحدود امکانات کا نام ہے جو اس کے تخلیقی عمل میں پوشیدہ ہے یعنی خدا خود تخلیق ہورہا ہے، اقبال کے فلسفے کا مسئلہ یہ ہے [اگر اسے فلسفہ تسلیم کیا جائے جو مشکل کام ہے] یہ مذہبی تجربات کے انکشافات سے ابتداء کرتا ہے لیکن ان پر کچھ ایسے قبل تجربی مفروضات کو مسلط کردیتا ہے جن کی بنیاد خود تجربہ نہیں ہے، مثلاً فکر اور وجود کا تعلق دوسرے یہ کہ جب انسانی تجربے سے آپ فلسفہ کا آغاز کریں تو پھر یہ تجربہ آپ کو جدھر لے جائے ادھر جانا ہوگا۔ اقبال کی ''خودی کا شعور'' تجرباتی انکشاف نہیں بلکہ عقلی دلیل کا نتیجہ ہے۔ یہ عقلی دلیل ہیگل کے نظام پر مبنی ہے۔ تیسری غلطی یہ ہے کہ خودی کے ذریعے خدا کی تفہیم بھی مذہبی تجربہ کا جزو نہیں ہے۔ یہ ایک عقلی تصور ہے۔ ان تصورات کو اقبال فکر اسلامی کی تشکیل نو کہتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک تاریخ ایک تخلیقی قوت کے اظہار کا نام ہے لیکن یہ تخلیقی قوت انسانی خودی کے علی الرغم از اول تا آخر کارفرما ہے۔ اگر انسان اس تخلیقی خودی کا شریک کار بھی ہے تو ایک بڑے کونیاتی سیاق میں اس کی شرکت حباب برآب ہے۔

اقبال کے تشکیل جدید کے مغربی نقطۂ نظر سے عصر حاضر کے جدیدیت پسندوں نے ایک زبردست نتیجہ اخذ کیا ہے اور یقیناً وہ یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں [''روح اور مادہ کی تقسیم وتفہیم میں تصوریت پسندوں، حقیقت پسندوں دونوں سے غلطی ہوئی ہے، تفہیم کے عمل میں دونوں ایک دوسرے کی طرف پشت کرنے کے بجائے آمنے سامنے ہوتے تو مغالطہ کم ہوجاتا، انسانی علم میں نہ تو کوئی کلی معروض ہے اور نہ موضوع دونوں ایک دوسرے کی تشکیل کرتے ہیں۔ اقبال کی فکر کو آگے بڑھایا جائے تو آج تشکیل فکر اسلامی کے اصول کے طور پر ہم یہ کہہ سکیں گے کہ حقیقت وہ ہے جو ہمارے اوپر منکشف ہو، انسان اس انکشاف میں اتنا ہی شریک ہے جتنی کہ حقیقت''] اقبال جس مقام پر پہنچانا چاہتے تھے جدیدیت پسند اس مقام پر پہنچ گئے، اس کا اندازہ اقبال کو ہوگیا تھا اسی لیے انھیں مباحث خطبات سے رجوع کرنے میں کوئی تامل، تاسف، توقف، تساہل نہ ہوا۔ اقبال کا فلسفہ ان کے اپنے الفاظ میں تتلی کا سا بے تاب تخیل ہے جو ایک نیم مستی کے عالم میں ایک پھول سے دوسرے پھول کی طرف اڑتا پھرتا ہے اور وسعت چمن پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالنے کے ناقابل نظر آتا ہے۔

[۱۱] علامہ اقبال ایم اے فلسفے کے امتحان میں تھرڈ ڈویژن میں کامیاب ہوئے ان کے استاد نکلسن تھے اور اس سال فلسفے میں علامہ اقبال واحد طالب علم تھے لہٰذا یہ کہنا کہ اقبال نے ایم اے فلسفے میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی تاریخی دروغ گوئی ہے غالباً اسی لئے اقبال کو کیمبرج میں دوبارہ داخلہ لینا پڑا اور میٹریکولیشن کے بعد وہ ''لنکن ان'' میں داخل ہوئے اور بی اے میں داخلہ لیا [واضح رہے کہ اقبال لاہور سے قانون کے امتحان میں بھی ناکام ہوگئے تھے اور یہ تعلیم ادھوری رہ گئی تھی اقبال جیسی عظیم شخصیت کو امتحانی نتائج کے پیمانے سے ناپنا انتہائی نادانی ہے، عبقریوں کا ذہنی علوان امتحانات کی گرفت سے باہر رہتا ہے، آئین اسٹائن کو زیورک یونیورسٹی کے ریاضی کے امتحان میں ناکام قرار دیا گیا تھا، لیکن اس ناکام طالب علم نے طبیعیات کی دنیا میں انقلاب برپا کردیا۔] یہ تمام معلومات خرم علی شفیق کی کتاب میں دیکھ سکتے ہیں۔

[۱۲] اقبال نے عربی میں کوئی کتاب نہیں لکھی ان کے مضامین خطبات خطوط میں عربی زبان لغات لسانیات پر کوئی بحث نہیں ملتی ایک آدھ خط میں کسی عربی شعر، عربی شاعر کا ذکر ملتا ہے ایک آدھ مضمون بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔

''شذرات فکر اقبال'' میں بھی صرف چند سطریں عربی ادبیات سے متعلق مل جاتی ہیں یہ اقبال کی کل کائنات ہے۔ Stray Reflection میں کسی مسلم فلسفی یا فقیہہ کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ شذرات فکر اقبال میں مسلم قوم کی حیرت انگیز تاریخ کے زیر عنوان اقبال نے ''ایک ہزار سال کی مسلم تاریخ کو توانا نسل کی تاریخ کہا ہے۔ اور مسلمانوں کے عظیم الشان

تہذیبی کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ ''مسلمانوں نے ایک منفرد نوعیت کا ادب تخلیق کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک مکمل نظام قانون مرتب کیا جو ہمارے مسلم فقہاء کا سب سے قیمتی ورثہ ہے'' [ص ۱۳۷] لیکن ۱۹۲۶ء میں مغرب کے زیر اثر اس قیمتی ورثے کے تار و پود بکھیرنے کی کوشش کی لیکن علماء کی صحبت کے باعث اقبال نے رجوع کر لیا۔ ہمیں یقین ہے کہ اقبال کی عربی دانی کے بارے میں ان مفصل معلومات کی روشنی میں اس دعوے کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ عربی پر عدم عبور کے باعث وہ علوم اسلامی میں رسوخ کے حامل نہ تھے وہ طالب علم دین تھے عالم نہیں تھے لہٰذا خطبہ اجتہاد لکھنے کے اہل نہ تھے۔ اسی لئے خطبہ اجتہاد میں اقبال نے امت کے اجماع سے انکار کی روایت قائم کی اور شاہ ولی اللہ کے محرف حوالے سے اپنے اجتہاد کا استدلال کیا خطبہ اجتہاد پر اقبال دس سال تک تصحیح و ترامیم کرتے رہے اور فقہ اسلامی کو مغرب کے سانچے سے ہم آہنگ بنانے کا تجربہ کیا تاکہ مسلمانوں کو سائنسی ترقی کے ذریعے دنیا کی امامت پر فائز کیا جا سکے۔

[۱۳] اقبال کے ذاتی ذخیرہ کتب میں بھی عربی کی امہات کتب کا اندراج نہیں ہے اپنی وصیت کے مطابق انہوں نے تمام کتابیں اسلامیہ کالج کو عطیہ کر دی تھیں کتابوں کی کل تعداد ۴۳۳ تھی اس ذخیرے میں دو کتابیں عربی کی دو فارسی کی ایک فرانسیسی کی کتاب تھی۔ ۶۱ کتابیں نصابی تھیں اور ۶۱ کتابیں Macmillan کمپنی کی ہیں دس کتابیں قانون سے متعلق ہیں کتابوں کے ذخیرے سے متعلق یہ معلومات ہمیں کس نتیجے پر پہنچاتی ہیں؟ سہیل عمر صاحب کس نتیجے پر پہنچانا چاہتے ہیں۔

[۱۴] عطیہ فیضی کی کتاب اقبال، اقبال کے خطوط، بیرون ملک علامہ اقبال کے دورے، خطبات علمی مذاکرے، مجالس، قیام یورپ میں مختلف اہل علم سے ملاقاتوں کے موضوعات میں عربی زبان ادب لغات، لسانیات کہیں بھی زیر بحث نہیں رہے، ہر جگہ فلسفہ اور اس کے متعلقات اور تاریخ حضرت اقبال کے موضوعات رہے۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی کی تحقیق کے مطابق ''علامہ اقبال نے بی اے کی ڈگری کے لیے فلسفہ و اخلاقیات یا [moral science] کے شعبے میں ایک تحقیقی مقالہ داخل کیا۔ [ص ۱۰۶، ۲۳۸، اقبال یورپ میں]

[۱۵] علامہ اقبال کے مقالے *The Development of Metaphysics in Persia* کے نسخہ برمنگھم مطبوعہ ۱۹۰۸ء پر واضح الفاظ میں درج ہے:

A contribution to the History of Muslim Philosophy

ڈاکٹر اختر سعید درانی نے لکھا ہے کہ ''ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء'' ''فلسفہ عجم'' کے نسخہ مار برگ کا صفحہ عنوان۔ یہ لڈوگ میکسیملین یونیورسٹی میونک کے شعبہ فلسفہ قسمت اول [یا دوم] میں انگریزی زبان میں پیش کیا گیا تھا۔ [ص ۲۳۵، اقبال یورپ میں]

[۱۶] خرم شفیق کی یہ تحقیق بھی درست نہیں کہ اقبال نے عربی میں پی ایچ ڈی کی، کیوں کہ درانی صاحب کچھ اور فرما رہے ہیں۔ خرم علی شفیق کی یہ تحقیق بھی درست نہیں ہے کہ اقبال نے لندن یونیورسٹی میں چھ ماہ لکچر عربی کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر درانی کے مطابق صرف تین ماہ اقبال نے تدریس کی یہ عرصہ اوائل نومبر ۱۹۰۷ء سے جنوری ۱۹۰۸ء کے آخر تک ہے۔ [ص ۴۹۹، اقبال یورپ میں] اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقبال نے کشن پرشاد کے نام خط میں چھ ماہ کا جو تجربہ لکھا وہ غلط بیانی تھی۔

ان دلائل کی روشنی میں سہیل عمر صاحب کا یہ دعویٰ خود غلط ہو جاتا ہے کہ اقبال نے عربی میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی تھی۔

غلام رسول مہر: سہیل عمر: ڈاکٹر الٰہی: ماجدؒ

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ماجد دریا آبادی نے یہ غیر ذمہ دارانہ بات کیسے کہی کہ اقبال نے یورپ جا کر مغربی فلسفے کی تعلیم حاصل کی''۔ اس اعتراض کا تعلق ماجد دریا آبادی کی غیر ذمہ داری سے نہیں بلکہ اقبال اکادمی کے ناظم اور دیگر محققین کی غیر ذمہ داری سے ہے جو ساحل کی مخالفت میں سلیمان ندویؒ کے امالی کو مسترد کرنے پر مصر ہیں۔ اگر یہ محققین مولانا غلام رسول مہر کے اس مضمون کو پڑھ لیتے جو اقبال کے انتقال پر انقلاب میں شائع ہوا تو شاید دریا آبادی پر لگایا جانے والا الزام بہ خوشی مولانا مہر پر بھی عائد کر دیتے۔ مولانا مہر لاہور میں رہتے تھے۔ اقبال سے قریبی مراسم تھے۔ اقبال کے ساتھ بیرون ملک اسفار میں شریک رہ چکے تھے۔ اقبال کی زندگی کے تمام گوشوں سے واقف تھے۔ انقلاب کے صفحات میں اقبال کی زندگی سے متعلق خبریں کثرت سے شائع ہوتی تھیں۔ لہٰذا وہ حیات اقبال کے ایک ایک گوشے سے واقف تھے، لیکن اس گہری واقفیت، اقبال سے براہ راست تعلق رابطے ربط غائبانہ کے باوجود وہ ۲۶/اپریل ۱۹۳۸ء کے انقلاب ہفتہ وار ایڈیشن جلد ۱۳ نمبر ۳۷ میں لکھتے ہیں ''علامہ نے گورنمنٹ کالج سے ایم اے پاس کیا، مضمون فلسفہ تھا، امتحان میں وہ سارے پنجاب میں اول رہے اور سنہری تمغہ حاصل کیا۔ حضرت علامہ پہلے اورینٹل کالج میں تاریخ وفلسفہ کے پروفیسر بنے، پھر گورنمنٹ کالج میں انگریزی اور فلسفہ کے اسسٹنٹ پروفیسر بنے۔ جرمنی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ [ص ۵۵۹، حیات اقبال کے مخفی گوشے]

صرف یہی نہیں عرب مفکر ڈاکٹر الٰہی نے اپنی کتاب کے ص ۲۳۳ پر لکھا ہے کہ ''اقبال نے تاریخ وفلسفہ کی تدریس کلیہ الشرقیہ لاہور میں کی اس کے بعد فلسفہ، انگریزی ادب وغیرہ کی تدریس کی ۱۹۰۵ء میں کیمبرج گئے اور میونخ سے فلسفے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

معلوم ہوتا ہے کہ خرم علی شفیق صاحب اور سہیل عمر حیات اقبال کے ان مخفی گوشوں سے بے خبر ہیں اور ماجد دریا آبادی اور سلیمان ندویؒ کا رد ضروری سمجھتے ہیں لیکن غلام رسول مہر کے تاریخی کذب کی تردید ضروری نہیں سمجھتے جس کے ذریعے اقبال کو سارے پنجاب میں اول قرار دیا گیا اور اورینٹل کالج میں پروفیسر کے منصب پر فائز کرا دیا گیا۔ جبکہ وہ میکلوڈ عربی ریڈر تھے اور عربی نہیں پڑھاتے تھے۔

ماجدؒ دریابادی کا نقد: اقبال کی زندگی میں

سہیل عمر صاحب نے عبدالماجد دریا آبادی کے بارے میں سید سلیمانؒ ندوی کے واقعے کو بھی تمسخر کا نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ [ص ۱۳] ان کے خیال میں یہ محض قصہ ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں جب کہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے علامہ اقبال کی زندگی میں ۲۶/جون ۱۹۳۱ء کو صدق میں لکھا تھا ''اقبال سرسید خواجہ کمال الدین اسلام کو جب یورپ کے سامنے پیش کرتے ہیں تو ڈرتے رہتے ہیں کہ کوئی بات بھی زبان سے ایسی نہ نکلنے پائے جو یورپ کے مذاق و طبیعت پر بار ہو، خطبات اگر اردو میں منتقل ہو کر بھی آئے تو اس کی اشاعت کا دائرہ بہت ہی محدود رہے گا اور فتنہ انشاءاللہ کسی وسیع رقبے تک پھیلنے نہ پائے گا [۲۶/جون ۱۹۳۱ء صدق، اس سلسلے میں ''بیداری'' کے شمارے بھی ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں جس میں خطبات اقبال وفکر اقبال پر صدق سے حوالے دیے گئے ہیں]

ماجدؒ کے نقد پر اقبالؒ کا ردعمل: صوفی تبسم کو خط

واضح رہے کہ یہ شذرہ ایک قاری کے خط کے جواب میں لکھا گیا تھا جس نے خطبات اقبال کے اردو ترجمے کی اشاعت کی خبر پر سخت تشویش کا اظہار کرتے ہوئے یورپ سے عبدالماجد دریا آبادی کو خط لکھا تھا اور اردو ترجمے کے باعث

خطبات کے الحاد کے اثرات پھیلنے پر ان کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ ''اقبالنامہ'' میں مولانا ماجد دریا آبادی کے نام اقبال کا خط مورخہ ۲۲ر مارچ ۱۹۲۵ء ملاحظہ کیا جاسکتا ہے جس میں خطبہ اجتہاد پر ماجد صاحب کی سخت تنقید کے نوٹ کے حوالے سے اقبال نے لکھا ہے'' مگر آپ کا نوٹ پڑھ کر مجھے بہت تعجب ہوا، معلوم ہوتا ہے کہ عدیم الفرصتی کی وجہ سے آپ نے وہ مضمون بہت سرسری نظر سے دیکھا ہے بہر حال میں آپ کا خط زیر نظر رکھوں گا۔ مضمون کا مسودہ ارسال فرمایئے'' ماجد دریا آبادی کی سخت تنقید کے بعد اقبال نے'' خطبہ اجتہاد'' کو روک لیا تھا لہٰذا ۲۱ر ستمبر ۱۹۲۵ء کو صوفی تبسم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں'' میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے..... میں نے اجتہاد پر مضمون لکھا تھا مگر دوران تحریر احساس ہوا کہ یہ مضمون اس قدر آسان نہیں..... موجودہ صورت میں مضمون اس قابل نہیں ہے کہ لوگ اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے آج تک شائع نہیں کیا۔ اس سلسلے میں اکبر شاہ نجیب آبادی کے نام اقبال کا خط معاملات کی نئی تہہ سے آگاہ کرتا ہے۔ اقبال اکادمی تو ابھی تک یہ بتانے سے قاصر ہے کہ اقبال نے خطبات کب لکھے؟ اور خطبات کا ترجمہ کب کیا گیا؟

خطبات اقبال کی درست تاریخ اشاعت کیا ہے؟

۲۲ر اگست ۱۹۲۲ء کو اقبالؒ سلیمان ندویؒ کے نام لکھتے ہیں کہ میرے لکچر آکسفورڈ یونیورسٹی چھاپ رہی ہے اردو ترجمہ نیازی صاحب نے ختم کرلیا ہے، اس کی طباعت بھی عنقریب شروع ہوگی [خط نمبر ۲۸، اقبالنامہ شیخ اشرف اقبال و سلیمان ندوی اختر راہی] اسی خط میں مولوی نور الحق سے مباحث مشرقیہ پڑھنے کا ذکر ہے اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے مطابق اقبال ان کے بھائی نور الحق سے مباحث مشرقیہ ۱۹۲۴ء کے لگ بھگ پڑھ رہے تھے۔

۲۵ر اپریل ۱۹۲۹ء کو سلیمان ندویؒ کے نام لکھتے ہیں [، خط نمبر ۴۳] لکچروں کا اردو ترجمہ انشاء اللہ کیا جائے گا، اصطلاحات کے متعلق آپ سے بھی مشورہ طلب کروں گا۔

۵ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو علامہ اقبالؒ غلام بھیک نیرنگ کے نام خط میں لکھتے ہیں [خط نمبر ۳] باقی رہا لکچروں کے ترجمے کا کام سو یہ کام ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے اور از بس مشکل ان لکچروں کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں جو مغربی فلسفے سے متاثر ہیں..... مگر میں خیال کرتا ہوں کہ اردو دں خواں دنیا کو شاید اس سے فائدہ نہ پہنچے کیونکہ بہت سی باتوں کا علم میں نے فرض کرلیا ہے کہ پڑھنے والے یا سننے والے کو پہلے سے حاصل ہے اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کچھ اور قصہ سناتے ہیں'' اس کتاب سے علماء بہت ناراض تھے بلکہ اس کا اردو ترجمہ کرنے میں بھی اگر تساہل ہوا ہے تو اس کی وجہ یہی تھی کہ اگر اس کا اردو ترجمہ ہوا تو ممکن ہے کہ علامہ اقبال پر علماء اعتراض کریں جیسے کہ یہ اکبر کی طرح کا کوئی دین الٰہی ہے یا کوئی نیا مذہب یا مذہب کی کوئی نئی تاویل پیش کرنے کی کوشش ہو، چنانچہ اس پر اعتراضات ہوئے بھی برصغیر کے علماء قدامت پسندی کے سبب زندگی میں ہونے والے تغیر کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، لہٰذا انھوں نے یہ سمجھا کہ خطبات مدارس آئندہ اسلام کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں..... یہی وجہ ہے کہ علماء نے اس کتاب پر شدید اعتراضات کیے ہیں۔ [جاوید اقبال، ''اقبال اور عصر جدید میں اسلامی ریاست کا تصور مشمولہ اقبال فکر اسلامی کی تشکیل جدید مرتب ڈاکٹر جعفری، ص ۷ تا ۴۷]

نذیر نیازی صاحب اپنی کتاب مرتبہ'' مکتوبات اقبال'' میں ثابت کرتے ہیں کہ اقبال نے ترجمے کے لیے پہلے ڈاکٹر عابد حسین پھر نذیر نیازی کے کسی دوست اور آخر میں نذیر نیازی کو ترجمے کا کام سپرد کیا، ترجمہ ۱۹۳۰ء میں شروع ہوگیا جب کہ اقبالنامہ کے مطابق ترجمہ نیازی نے ۱۹۲۲ء میں ختم کرلیا تھا۔ ۱۹۲۸ء تک اقبال نے صرف تین خطبات لکھے تھے، تین ۱۹۲۹ء میں لکھنے کا ارادہ تھا تو خطبات ۱۹۲۲ء میں طباعت کے لیے کیسے جا رہے تھے؟ حمزہ فاروقی کی تحقیق کے

مطابق اقبال نذیر نیازی کے ترجمے سے مطمئن نہ تھے۔ سہیل عمر کا خیال بھی یہی ہے کہ ترجمہ کامل نہیں ہے، کئی مقامات پر بات غیر واضح ہے۔ اصل متن کے مطالعے کے بغیر اس پر انحصار کرنا درست نہیں، لیکن اب تک کے تمام تراجم میں یہی ترجمہ خطبات کے موقف سے قریب تر ہے۔ افسوس کہ اکادمی آج تک خطبات کا درست ترجمہ شائع کرنے کی سعادت سے محروم ہے۔ اس بیان کی روشنی میں ڈاکٹر وحید عشرت کا ترجمہ بھی ناقص قرار پاتا ہے جو سہیل عمر صاحب کی زیر نگرانی شائع ہوا ہے۔ اگر اکادمی خود ناقص، غیر معتبر، محرف ترجمے شائع کر رہی ہے تو دوسروں سے شکوے کا کیا جواز ہے؟

سہیل عمر صاحب کی غلطیاں:

سہیل عمر صاحب نے ص ۱۰ پر تحریر فرمایا ہے کہ ''اقبال نے اجتہاد کے موضوع پر پہلی بار لاہور میں ۱۹۲۵ء میں خطبہ دیا'' ان کا یہ بیان بھی واقعاتی غلطی ہے۔ علامہ اقبال نے یہ خطبہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۴ء کو شام ساڑھے چھ بجے اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں دیا تھا'' اقبال اکادمی کی جانب سے اس غلطی کا کوئی جواز نہیں۔

سہیل عمر صاحب نے لکھا ہے کہ اقبال کبھی نہیں بدلا لیکن اکادمی کی اپنی کتاب ''اقبال کی تصویری سوانح'' کا صفحہ نمبر ۴۳ پڑھنا بھول گئے جہاں علامہ اقبال عالم اسلام کے فلسفے پر ہندو مذہب کے فلسفے کی برتری کے قائل تھے لیکن کیمبرج جانے کے بعد ان کے خیالات تبدیل ہو گئے۔

Arabas could not produce men like. Kapila and sankar acharya.

This inferiority complex does not surface anywhere in his thesis. The Development of Metaphysic in Persia, eighteen months of first hand interaction with the works of great Muslim philosophers and scientists made him aware that the Muslim to had been great thin ker.

اس اعتراف کے باوجود اقبال اکیڈیمی کا یہ دعویٰ کہ اقبال نے کبھی شمال سے جنوب رخ نہیں موڑا، اقبال کبھی نہیں بدلا، کیا ایک درست دعویٰ ہے؟ کیا اقبال کے دونوں خیالات متضاد نہیں ہیں؟

اقبالؒ کا مستشرقین پر حد سے زیادہ اعتماد:

خطبات میں حجازی اور عراقی فقہا کی نسلی بنیادوں پر تنقیح کا معاملہ بھی اقبال کی مغرب سے مرعوبیت کا ایک سبب ہے۔ اقبال پر مستشرق میکس ہورٹن کا بہت اثر تھا جو اسلام کے فکری اور مذہبی اختلافات کی بنیادیں نسلی پس منظر میں تلاش کرنا تھا۔ علامہ اقبال نے اس مستشرق کے کثرت سے حوالے دیے ہیں۔ اور اس کی نسلی توجیہہ کو تسلیم کر کے خطبات میں فقہ اسلامی پر نقد کے استدلال کی غلط سلط عمارت، ہورٹن کے بودے دلائل پر تعمیر کی ہے۔

اقبال کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقاء'' بھی فکر اسلامی کے مطالعات میں سامی اور آریائی ذہنوں کی نسلی کشاکش کے تناظر میں لکھا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال قیام یورپ میں اسلام کا مطالعہ خالصتاً مستشرقین کے نقطہ نظر سے کرتے تھے۔ صابر کلوروی کی تحقیق کے مطابق علامہ اقبالؒ نے اپنی کتاب ''تاریخ تصوف'' کا انحصار فلسفہ عجم کے ماخذات پر رکھا اور اس کتاب کی تیاری میں علامہ کا ماخذ زیادہ تر انگریزی زبان میں لکھی جانے والی کتب تھیں۔ [ص ۱۱۹، ضمیمہ تاریخ تصوف صابر کلوروی تعمیر انسانیت] تصوف پر لکھتے ہوئے اگر عربی، فارسی مصادر پیش نظر نہ ہوں تو اس تحقیق کی علمی حلقوں میں کیا وقعت رہ جاتی ہے؟ حلاج کے بارے میں بھی اقبال کی آخری تحقیقات لوئی ماسینون سے ماخوذ ہیں جس نے علاج کو وحدت الوجودی کے بجائے اسلامی توحیدی ثابت کیا، لہٰذا حلاج جاوید نامہ میں فلک مشتری پر اقبال

سے ملاقی ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں حلاج کا نعرہ اناالحق گمراہی تھا، لیکن زبور عجم میں وہ ''صدیق خودی'' ہوگیا اور اناالحق ''خودی'' کی ایک تعبیر بن گیا۔ ۹ رفروری ۱۹۱۶ء کو وکیل میں اقبال نے لکھا تھا ''خواجہ حسن نظامی کو معلوم نہیں کہ یورپ کا علمی مذہب وحدت الوجود ہے جس کے حامی خواجہ حسن نظامی ہیں، لیکن ۱۹۳۰ء میں خطبات شائع ہوئے تو کئی مقامات پر اقبال وحدت الوجود کے شارح کے طور پر سامنے آئے۔ خطوط اقبال سے اقبال کے اس ذہنی سفر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے جو ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۳ء تک جاری رہا اور ابن عربی صرف ابن عربی کے درجے سے ترقی کرتے کرتے اقبالؒ کی نظر میں حضرت شیخ ابن عربیؒ ہوگئے۔

اقبالؒ کا عجیب وغریب رویہ:

سہیل عمر صاحب اس سوال کا بھی جواب دیں کہ سلیمان ندویؒ کے نام اقبال نے ۲، ۲۲، ۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء کے خطوط میں شبلی کے ترجمے میں تحریف سے متعلق جو استفسارات کیے ہیں ان میں کہیں خطبہ اجتہاد کے حوالے سے کوئی گفتگو نہیں کی گئی ہے۔ وہ سلیمان ندویؒ کو یہ نہیں بتا رہے کہ خطبات اشاعت کے لیے جا رہے ہیں، اس میں شبلی کا حوالہ موجود ہے۔ شاہ ولی اللہ کا مؤقف درست ہے یا شبلی کا سلیمان ندویؒ کے نام تمام خطوط میں خطبات کے بے شمار مباحث پر استفسارات ہیں لیکن کسی خط میں خطبات تحریر کرنے کا براہ راست ذکر نہیں کیا جاتا اور خطبات کے بین السطور کے لیے براہ راست استفادے کا اشارہ نہیں ملتا اس اخفاء کی کیا توجیہہ کی جاسکتی ہے جبکہ سلیمان ندوی کے نام خطوط میں جو سوالات پوچھے جا رہے ہیں وہ براہ راست خطبات کے مضامین سے متعلق ہیں لیکن ان خطوط میں صرف اجتہاد پر ایک مضمون لکھنے کا عندیہ دیا گیا ہے خطبات کا تاثر نہیں دیا گیا کیا اقبال سلیمانؒ ندوی سے خطبات کو اشاعت سے قبل مستور رکھنا چاہتے تھے انہوں نے ماجدؒ دریا آبادی کو خطبہ کا مسودہ ارسال کیا لیکن سلیمانؒ ندوی کو خطبات کا مسودہ کیوں ارسال نہ کیا؟

فلسفہ عجم کے مقالے کے لیے حسن نظامی سے استفادہ:

اس سلسلے میں اقبال کے قیام یورپ کے دوران رویے کا غائر نظائر سے مطالعہ کیا جائے تو بعض اہم معلومات سامنے آتی ہیں جس سے اقبال کے منہاج، طریقہ تحقیق، اخذ واستفادہ کے اصول کا اندازہ کیا جاسکتا ہے مثلاً ٹرینٹی کالج کیمبرج میں ان کے مقالے کا موضوع ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقاء تھا اس مقالہ کے باب پنجم کی تالیف کے لئے علامہ اقبال نے لوازمہ خواجہ حسن نظامی سے طلب کیا لیکن انہیں یہ نہیں بتایا کہ اس کا مصرف کیا ہوگا ۸/ اکتوبر ۱۹۰۵ء کے خط میں نظامی صاحب سے تصوف قرآن وجودی تصوف اسلام پر لوازمہ طلب کرتے ہیں اور انہی معلومات کی بنیاد پر پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی لکھتے ہیں انہی معلومات کی بنیاد پر اور اقبال نے ۱۹۰۸ء میں لندن میں اسلامی تصوف پر خطبہ بھی دیا۔

حسن نظامی اور اقبال: دیکھنے کو دو حقیقت میں ایک: اقبالؒ

۱۹۰۵ء میں خواجہ حسن نظامی سے تعلقات کی نوعیت یہ تھی کہ کیمبرج سے خط آرہا ہے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لئے حسن نظامی سے تصوف، قرآن، وحدت الوجود کا قرآن سے استشہاد وغیرہ معلوم کیا جارہا ہے تصوف کی معقولی اور منقولی تاریخی تفصیل طلب کی جارہی ہے اور لکھتے ہیں کہ ''آپ سے اور قاری صاحب سے استصواب ضروری ہے حسن نظامی کو مکرمی سید صاحب زادو وعمرۂ اسرار قدیم سید حسن نظامی، پر اسرار نظامی سرمست سیاح کو سلام، پیارے نظامی، مخدومی خواجہ صاحب، ڈیر خواجہ صاحب اور خواجہ صاحب مکرم لکھتے ہیں اس طرح کہ القابات اور بے تکلفی بہت کم خطوط میں ہمیں نظر آتی ہے حسن نظامی سے تاریخی طور پر تصوف کے اسلام سے تعلق کا ثبوت علمی طلب فرماتے ہیں اپنے پہلو میں آباد بت خانے کے پرانے مکان کی سیر کی دعوت دیتے ہیں ''رام کرشن'' کے ذریعے نظامی کے طریق اشاعت مذہب حقہ کی تائید کرتے ہیں۔ یہاں تک لکھتے ہیں کہ ''مجھ میں اور آپ میں فرق ہی کیا ہے دیکھنے کو دو حقیقت میں ایک'' حسن نظامی پر ہونے والے اخباری

حملوں کی مذمت کر کے مسلمانوں کو بداخلاق قرار دیتے ہیں والدہ محترمہ کی نیاز بھجواتے ہیں یہ بھی لکھتے ہیں کہ آپ اپنی ہر تحریک میں مجھے شریک تصور کیجئے'' مجھے بھی اس حلقہ میں شامل تصور کیجیے اور اہل حلقہ سے استدعا کیجیے کہ میرے حق میں دعا کریں'' ضروری امر میں مشورہ اور حسن نظامی کی مدد طلب کرتے ہیں'' لکھتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نادانستہ اسی طرف جارہے ہیں جس طرف میں آپ کو لانا چاہتا ہوں میری طرف سے مزار شریف پر حاضر ہو کر عرض کیجیے۔ پنجاب میں نظامی مشہور ہوں اور آپ میری خبر نہیں لیتے ۱۲ روپے کا حلوہ حسن نظامی سے پکوا کر خانقاہ کے متعلقین میں تقسیم کراتے ہیں فرماتے ہیں کہ آپ نے ہندوستان کے پرانے بتکدے میں توحید کی مشعل روشن کی دل اس کی حدت سے گرمائیں گے آنکھیں منور ہوں گی میں بھی اپنی بساط کے مطابق حاضر کروں گا مثنوی کے نام کے لئے خواجہ سے رجوع کرتے ہیں۔[اقبالنامہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۵ء تک کے خطوط]

حسن نظامی جاہل شخص ہیں: اقبالؒ

یکا یک حسن نظامی کے خلاف اقبال مورچہ گرم کرتے ہیں وجہ مثنوی اسرار خودی کا دیباچہ اب لکھتے ہیں ''حسن نظامی معذور ہیں وہ صوفی ضرور ہیں مگر تصور کی تاریخ وادبیات وعلوم القرآن سے مطلق واقفیت نہیں رکھتے اس واسطے مجھے ان کے مضامین کا مطلق اندیشہ نہیں حسن نظامی نے عام طور پر میری نسبت مشہور کر دیا ہے کہ میں صوفیائے کرام سے بدظن ہوں اس واسطے اپنی پوزیشن صاف کرنی ضروری تھی ورنہ طویل مضمون لکھنے کی ضرورت نہ تھی حافظ پر میں نے اعتراض کیا تھا اس واسطے ان کا خیال ہے کہ میں تحریک تصوف کو دنیا سے مٹانا چاہتا ہوں۔

''حافظ پر میرے ریمارک تصوف اور ولایت پر حملہ کے مترادف سمجھے گئے خواجہ حسن نظامی نے ایسا سمجھ کر اخباروں میں لکھا اس واسطے مجھے مجبوراً تصوف پر اظہار خیال کرنا پڑا۔ اسرار خودی میں حافظ پر جو کچھ لکھا گیا ہے اسے خارج کر کے اور اشعار لکھے ہیں جن کا عنوان یہ ہے'' درحقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ'' ان اشعار کو پڑھ کر غلط فہمی دور ہو جائے گی۔[اکبر الہ آبادی کے نام خطوط اقبالنامہ] اسرار خودی کے معرکے میں حضرت علامہ اقبالؒ کو صوفی حسن نظامیؒ نے پسپا کر دیا اور اقبالؒ نے دیباچہ حذف فرما دیا اکبر الہ آبادی بھی اس مرحلے پر اقبال کے ساتھ نہ تھے آخر ش جولائی ۱۹۲۸ء میں اقبال نے لکھا ''خواجہ حسن نظامی سے دلی محبت ہے جس پر اختلاف خیال بھی قطعاً کوئی اثر نہیں کر سکتا اور اصل بات تو یہ ہے کہ وہ اختلاف بھی کم از کم میرے علم اور سمجھ کے مطابق کوئی ایسا اختلاف نہیں وہ کچھ عرصہ ہوا یہاں تشریف لائے تھے ٹھہر نہ سکے زبانی باتیں ہوتیں تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتیں لیکن جو کچھ بھی ہو اس سے محبت میں کمی نہیں ہو سکتی جو مجھ کو ان سے ہے وہ نہایت محبوب آدمی ہیں ان کو جان کر ان سے محبت نہ رکھنا ممکن نہیں''۔

سہیل عمر صاحب تشریح فرمائیں کہ اس معاملے میں اقبال کا کون سا موقف درست ہے کیا اسے تلون مزاجی [کم سے کم اور نرم سے نرم الفاظ میں] کہا جائے یا تضاد شخصیت، یا سیمابی طبیعت، اقبال کے تمام خطوط کا مطالعہ کیا جائے تو کم و بیش ہر جگہ یہی جوار بھاٹا نظر آتا ہے لیکن زندگی کے آخری سالوں میں اقبال کا راہوار فکر ایک خاص رنگ اور ڈھنگ کے ساتھ راسخ العقیدہ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے پھر اقبال کا یہ حال تھا کہ ذکر رسالت مآب کے ساتھ ہی آنسو کی جھڑی لگ جاتی اس محبت نے اقبال کو رجوع کی منزل تک پہنچا دیا لیکن سہیل عمر صاحب کو سلیمان ندوی کی شہادت پسند نہیں ہے اس ناپسندیدگی کا علاج کم از کم ہمارے پاس تو نہیں ہے۔

کیا اقبال نے تصوف پر نکلسن کی کتاب نہیں پڑھی تھی؟

۱۹۱۹ء تک حضرت علامہ اقبال منصور حلاج کے شدید مخالف تھے اور اس کے کفر کے شدت سے قائل ان کا

خیال تھا کہ حلاج وحدت الوجودی صوفی تھا اور اس وقت وہ وحدت الوجود کے فلسفے کو الحاد و زندقہ سمجھتے تھے لیکن رینالڈاے نکلسن کی تصنیف The Idea of Personality in Sufism اقبال کی نظر سے گذری تو ان کے خیالات یک دم بدل گئے بشیر احمد ڈار کے مطابق نکلسن نے ثابت کیا تھا کہ حلاج وحدت الوجودی نہ تھا اور اس کے نعرہ انا الحق کا مطلب وہ نہیں جو وحدت الوجودی شعراء اور مفکرین نے پیش کیا ہے لیکن بشیر احمد ڈار کی یہ تحقیق درست نہیں کیونکہ نکلسن نے اپنی تصنیف میں حلاج کی بڑی بھیانک تصویر کشی کی ہے اسے مسیحی صوفی ثابت کیا ہے جو رسالت مآبؐ کی امت میں تھا جس نے بہ ظاہر رسالت مآب کی ثناء کی لیکن بہ باطن اس مدح کا مقصود عیسیٰ علیہ السلام ہیں جو شان ایزدی رکھنے والے شخص کا کامل نمونہ ہیں حلاج کا نعرہ انا الحق قدیم یہودی اور نصرانی روایات کا حامل ہے اس میں شامی مسیحیت کا عقیدہ لاہوت و ناسوت مضمر ہے۔[The Idea of Personality in Sufisim ص ۲۹ تا ۳۱] اگر بشیر ڈار کی شہادت درست تسلیم کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ علامہ اقبال نے نکلسن کی کتاب بھی نہیں پڑھی یا پڑھی تو اس کے مطالب درست طرح سے اخذ نہ کر سکے ورنہ حلاج ان کے یہاں عظیم ہستی کے طور پر نہیں آ سکتا تھا پھر اس تبدیلی کی وجہ کیا ہے کیا فان کریمر یا لوئی مائی سی نون کیا یہ بات اقبال کی مستشرقین پر اعتماد کو ظاہر نہیں کرتی جس طرح خطبات میں وہ میکس ہورٹن اور گولٹ پر انحصار کرتے ہیں یہ موضوع بھی سہیل عمر صاحب کو دعوت تحقیق دے رہا ہے۔

اقبال نے اسرار خودی کا دیباچہ کیوں حذف کر دیا؟

صفحہ گیارہ پر سہیل عمر صاحب نے ماجد صاحب اور سلمان ندویؒ کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر یہ دونوں اقبال کے خلاف کچھ لکھتے تو ان کا رسالہ اور کتاب امت سے چھن جاتی۔ حسن نظامی نے اسرار خودی پر معرکہ گرم کیا تو کیا ہو گیا؟ ان اعتراضات کا جواب ساحل کے زیر نظر شمارے کے صفحہ ۶۳، ۶۴ پر ملاحظہ فرمایئے اور جاوید اقبال کے مضمون کے مندرجات بھی پڑھ لیجیے جس سے معلوم ہوگا کہ اقبالؒ علماء سے محبت بھی کرتے تھے اور ڈرتے بھی تھے اسی لئے جب حسن نظامی نے اسرار خودی کے دیباچے پر معرکہ گرم کیا تو اقبالؒ نے کتاب سے اس دیباچے کو حذف کرا دیا یہ الگ بات ہے کہ اس دیباچے کے مضامین نکلسن کے ذریعے انگریزی ترجمے میں دوبارہ شامل کرا دیے اقبالؒ کا اکبر شاہ نجیب آباد کے نام خط پڑھ لیجیے سہیل عمر صاحب کی تسلی و تشفی ہو جائے گی۔ سہیل عمر صاحب یہ بھول گئے کہ مولوی حسن نظامی سے اقبال کا معرکہ ہوا تو اقبالؒ کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ اس معرکے کا نتیجہ یہ نکلا کہ علامہ نے مثنوی اسرار خودی سے حافظ کے متعلق قابل اعتراض اشعار نکال کر بعض نئے اشعار کا اضافہ کر دیا۔ [سہیل عمر صاحب سراج احمد کے نام اقبال کے خطوط فراموش نہ کریں، جس میں تصوف، ایرانی تصوف، ایرانی شعراء، حافظ، عجمی روایات ہندوستان پر عجمی اثرات کے سلسلے میں اقبال نے اپنے خیالات نہایت شرح وبسط سے پیش کیے اور تصوف کے خلاف جہاد کا اعلان فرمایا اور کتاب لکھنے کا عزم کیا، لیکن خواجہ حسن نظامی کے چند حملوں کے بعد ان تمام عزائم سے توبہ فرمالی۔ یہ درست بات ہے کہ اس تبدیلی میں اکبر الہ آبادی اور والد محترم کے مشوروں اور نصیحتوں کا بھی دخل تھا۔ اسرار خودی کا دیباچہ بھی اقبال کو خارج کرنا پڑا اور اکبر کی مداخلت پر حسن نظامی سے صلح کرنا پڑی۔ [ص ۱۷، ۱۸، صابر کلوروی] سہیل عمر یہ بھول گئے کہ اقبال کی تاریخ تصوف متعدد وجوہ کی بنیاد پر مکمل نہ ہو سکی مواد کی کمی اور کتابوں کی عدم فراہمی پروفیسر نکلسن کی کتاب تصوف کی اشاعت، حسن نظامی اور علماء کی شدید مخالفت رموز بے خودی کی تصنیف اسرار خودی کے قلمی ہنگامے کا سرد ہو جانا۔ علامہ اقبالؒ اس ٹھنڈی آگ کو دوبارہ سلگانا نہیں چاہتے تھے۔ یہ کتاب بھڑوں کے چھتے میں دوسرا پتھر ثابت ہو سکتی تھی۔

علماء کا خوف یا مرتب امالی کا اندیشہ:

سہیل عمر صاحب نے بار بار مرتب امالی کے خوف کی نشاندہی کی ہے اگر وہ جاوید اقبال کا مضمون پڑھ لیتے جو پاکستان اسٹڈی سینٹر نے شائع کیا ہے تو یہ اعتراض نہ کرتے زیر نظر شمارے کے صفحہ ۳۹ کا وہ مطالعہ فرمالیں جاوید اقبال فرماتے ہیں کہ علماء خطبات کو آئندہ اسلام کے لئے خطرہ سمجھتے تھے یہ الفاظ مرتب امالی کے نہیں فرزند اقبال کے ہیں اگر یہ بات سلیمان ندوی نے کہی تھی تو کیا غلط تھا یہی بات تو جاوید اقبال لکھ رہے ہیں۔

کیا اقبال کسی سے نہ ڈرتے تھے؟

خطبات اقبال کب لکھے گئے ان کی صحیح تاریخ سے ہم اور اقبال اکادمی یکساں طور پر لاعلم ہیں اس سلسلے میں زیر نظر شمارے کا صفحہ ۳۷ اور ۳۸ ملاحظہ کیجیے سہیل عمر فرماتے ہیں کہ اقبال کسی سے ڈرتے نہ تھے جو خیالات رکھتے تھے بہ بانگ دہل بیان کرتے تھے غالباً سہیل عمر عطیہ کے نام اقبال کا وہ خط بھول گئے جس میں لکھا ہے ''لیکن وہ خیالات جو میری روح کی گہرائیوں میں ایک طوفان بپا کئے ہوئے ہیں عوام پر ظاہر ہوں تو پھر مجھے یقین واثق ہے کہ میری موت کے بعد میری پرستش ہوگی دنیا میرے گناہوں کی پردہ پوشی کرے گی آخر خیالات کے اظہار میں کیا امر مانع تھا؟

اقبال ملکیت زمین کے قائل نہ تھے لیکن عمل؟

اس سوال پر بھی غور کی ضرورت ہے کہ اقبال ملکیت زمین کے قائل نہ تھے لیکن خود زمین کی ملکیت حاصل کی مکان تعمیر کیا اور جاوید کے نام کر دیا صرف یہی نہیں نذیر نیازی کو بھی ۱۹۳۵ء میں ملکیت زمین دلانے کے لیے کوشاں رہے تا کہ وہ ان کے قریب رہائش پذیر ہوں۔ نذیر نیازی نے بیمہ کمپنی کی ملازمت کے سلسلے میں اقبالؒ سے مشورہ کیا تو اقبال نے مفتی عبدہٗ کے فتوے سے جواز کی اجازت دی لیکن نذیر نیازی نے اس فتوے کو رد کر دیا آخر تک نذیر نیازی کا خیال یہی تھا کہ بیمہ زندگی اور اس قسم کے دوسرے ادارے اسلامی نظام زندگی میں کسی طرح نہیں کھپ سکتے اس سلسلے میں نذیر نیازی کے دلائل مکتوبات اقبال کے ص ۸۲ پر دیکھے جا سکتے ہیں افسوس کہ حضرت علامہ اقبال کو اس موضوع پر وہ آگہی حاصل نہ تھی جو ان کے ایک مداح کو رسوخ فی العلم کے باعث حاصل ہوگئی۔ [سہیل عمر صاحب مکتوبات اقبال کا ص ۴۳ بھی ملاحظہ فرمالیں۔]

''عالم اسلام کے انحطاط کے باعث حضرت علامہ کا فکر بہت کچھ عسیر الفہم ہو گیا تھا علامہ شروع ہی سے محسوس کر رہے تھے کہ خیالات کا اظہار جس طرح اشاروں ہی اشاروں میں اور اختصار سے کیا ہے اس سے وہ اپنا مافی الضمیر کما حقہ ظاہر نہیں کر سکے..... چوہدری صاحب کو ایک تو اس امر ہی سے اختلاف تھا کہ خطبات کا اردو میں ترجمہ کیا جائے مسلمانوں کو مسائل فلسفہ سے کوئی دلچسپی نہیں یوں بھی اس کی کیا ضرورت ہے مسلمانوں کے لئے یہ مسائل ضمنی ہیں اصولی نہیں علاوہ ازیں یہ ممکن ہے کہ بہ سبب ایجاز کلام اس سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں یا پیدا کر دی جائیں پھر چونکہ مباحث فلسفیانہ میں لہٰذا کوئی نیا فتنہ کھڑا کر دیا جائے جیسا کہ قاہرہ میں مقیم ایک ہندی نژاد بزرگ نے ہندوستان کے ایک پرچے میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اقبال کا فکر فلسفہ مغرب سے دب گیا ہے اور اگر اس کی اشاعت اردو میں ہوئی تو علماء کا فرض ہوگا کہ وہ علی گڑھ کے نیچری فتنے کی طرح اس کا بھی استیصال کریں نیز ملاحظہ ہو اس سلسلے میں راقم کا مضمون ''اقبال کی آخری علالت رسالہ ردو اقبال نمبر میں]

ترجمہ خطبات میں اقبال کی احتیاط؟

اس بات کی تحقیق بھی ضروری ہے کہ علامہ اقبال نے خطبات کے ترجمے کے وقت سلیمان ندوی اور ماجد دریا آبادی سے استفادہ کے بجائے نذیر نیازی کو ہدایت دی کہ وہ سورتی صاحب اور اسلم جیراج پوری سے مشورہ کریں۔ جیراج

پوری اہل قرآن تھے اور سلیمانؒ ندوی اور ماجد صاحب کے مقابلے میں بہت زیادہ آزاد خیال کیا اقبال کو خطرہ تھا کہ اگر مشورہ کیا گیا تو بہت سے معاملات قبل از وقت آشکار ہوجائیں گے؟ لیکن بعد میں اقبال کو خود خیال آ گیا کہ یہ راستہ درست نہیں ہے یوم اقبال کے موقع پر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں علامہ اقبال کی تقریر بھی اس کا واضح ثبوت ہے۔ اقبال نے اپنے منہاج علم کو غلط قرار دیا تھا۔ اس کی تفصیل انقلاب میں مطالعہ کی جاسکتی ہے۔

اقبال اکادمی کی توجہ کے لیے:

[۱] تصوف، فلسفہ عجم، مابعد الطبعیات عجم میں اقبال نے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی لیکن ۴ فروری ۱۹۱۶ء تک انھوں نے سید احمد شہید کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' نہیں پڑھی تھی لکھتے ہیں کہ ''تاریخ تصوف سے فارغ ہولوں تو تقویۃ الایمان کی طرف توجہ کروں فی الحال جو فرصت ملتی ہے وہ اس مضمون کی نذر ہوجاتی ہے'' [ص ۳۸۴۔۳۸۵ مکاتیب، ن ۱۱] سید احمد شہید کی عبقات بھی ان کی نظر سے نہیں گزری تھی سلیمان ندوی سے استفسار کرتے ہیں کہ ''عبقات'' کہاں سے دستیاب ہوگی [۳۳:س:م:۱۴۲:ن ۱۱]

[۲] ایک جگہ لکھتے ہیں گولٹ زی چر کی کوئی انگریزی تصانیف نہیں ہیں وہ ایک جرمن یہودی ہے اور انگریزی میں نہیں لکھتا اس کی مشہور ترین کتب جرمن زبان میں ہیں اور ان میں کوئی خاص چیز مجھے تو نظر نہیں آئی میں یورپین مستشرقین کا قائل نہیں کیونکہ ان کی تصانیف پر سیاسی پروپیگنڈہ یا تبلیغی مقاصد کی تخلیق ہوتی ہے [۳۰:ج:م:۴۱۵:ن ۱۱] ایک طرف گولٹ کے بارے میں یہ رائے ہے دوسری جانب ۱۹۳۰ء میں خطبات اشاعت کے لئے جارہے ہیں اور گولٹ کی تحقیقات کی بنیاد پر اقبالؒ سنت وحدیث کا بحیثیت ماخذ قانون انکار فرمارہے ہیں اور سہیل عمر صاحب اس انکار کی تین تاویلات کررہے ہیں ہر تاویل متضاد ہے۔

[۳] کشن پرشاد کے نام خط میں اقبال لکھتے ہیں ''مجھ کو عارضی طور پر چھ ماہ کے لئے لندن یونیورسٹی کا عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا تھا'' [۱۹۱۷:ک پ:ک م ا:اول:۵۹۰:ا ن]

اقبال اکادمی کی ''تصویری سوانح اقبال کے مطابق اقبال لیکچر مقرر ہوئے'' ڈاکٹر اختر سعید درانی کی تحقیق کے مطابق اقبالؒ نے صرف تین ماہ آرنلڈ کی عدم موجودگی میں تدریس کی ان تضادات کی کیا توجیہہ کی جائے؟ رفیع الدین ہاشمی صاحب کا ارشاد ہے کہ:

لندن یونیورسٹی کے تدریسی تجربے کے سلسلے میں اقبال کا بیان ہی سند ہے کیا یہ سند اب بھی قابل قبول رہے گی؟

[۴] علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ جرمنی میں عام طور پر مقالہ PHD جرمن زبان میں مرتب کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے مجھے اپنے کیمبرج کے اساتذہ کی سفارش کی بناء پر اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا پی ایچ ڈی کا امتحان زبانی جرمن میں ہوا جو میں نے دوران قیام تھوڑی بہت سیکھ لی تھی [ص ۵۳۲:م:ن ۱۱]۔ اختر سعید درانی کی تحقیق یکسر مختلف ہے ان کی تحقیق کے مطابق انگریزی میں مقالہ لکھنے کے لئے خاص اجازت کی کوئی ضرورت نہ ہوا کرتی تھی اقبال کا امتحان انگریزی میں ہوا تھا۔ مزید برآں پروفیسر SCHICK بالخصوص انگریزی زبان کے ماہر تھے اور زبانی امتحان لینے والوں میں شامل تھے۔ یونیورسٹی پروفیسران دنوں بھی عموماً انگریزی جانتے تھے پروفیسر شک کو اسی لیے ممتحنوں کے بورڈ میں شامل کیا گیا یہ بات بھی درست نہیں کہ اقبال نے امتحانِ زبانی کے لیے جرمنی میں جرمن سیکھی وہ لندن میں بھی جرمن زبان سیکھ رہے تھے۔ جب انگریزی میں مقالہ لکھنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہ تھی تو کیمبرج کے اساتذہ کی سفارش کا ذکر کیسے آ گیا۔ سہیل عمر

صاحب کے فلسفہ تضادات کے مطابق ان تضادات کی کیا توجیہہ کی جاسکتی ہے یقیناً دونوں میں سے ایک غلط بیانی کر رہا ہے لیکن کون؟ اس کا فیصلہ ہم سہیل عمر صاحب پر چھوڑتے ہیں کیونکہ علامہ اقبال کی قسمت کے فیصلے کا اختیار تو صرف ان ہی کے پاس ہے۔

مغرب: اقبالؒ کی معذرت خواہی:

جناب سہیل عمر اور محترم احمد جاوید صاحب اقبال کی ان معذرت خواہیوں کے حق میں کیا تاویل پیش فرمائیں گے۔

[۱] یورپ میں اسلام کا سیاسی زوال بدقسمتی سے ایسے وقت ہوا جب مسلم حکماء کو اس حقیقت کا احساس ہونے لگا تھا کہ استخراجی علوم لایعنی ہیں .....دنیائے اسلام میں تحریک ذہنی عملاً اس وقت مسدود ہوگئی اور یورپ نے مسلم حکماء کے غور وفکر کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہونا شروع کیا۔ یورپ میں جذبہ انسانیت کی تحریک بڑی حد تک ان قوتوں کا نتیجہ تھی جو اسلامی فکر سے بروئے کار آئیں یہ کہنا مطلق مبالغہ نہیں ہے کہ جدید یورپین جذبہ انسانیت کا جو ثمر جدید سائنس اور فلسفہ کی شکل میں برآمد ہوا ہے اسے کئی لحاظ سے محض اسلامی تمدن کی توسیع پذیری کہا جاسکتا ہے اس اہم حقیقت کا احساس نہ آجکل کے یورپین کو ہے اور نہ مسلمانوں کو کیونکہ مسلمان حکماء کے جو کارنامے محفوظ ہیں وہ ابھی تک یورپ، ایشیاء اور افریقہ کے کتب خانوں میں منتشر اور غیر مطبوعہ شکل اور حالتوں میں ہیں۔ آج کل کہ مسلمانوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ایک بڑی حد تک خود ان کے تمدن سے برآمد ہوا ہے وہ اسے بالکل غیر اسلامی تصور کرتے ہیں مثلاً اگر کسی مسلم حکیم کو یہ معلوم ہو کہ آئن سٹائن کے نظریہ سے کسی قدر ملتے جلتے خیالات پر اسلام کے سائنٹفک حلقوں میں سنجیدگی سے بحث ومباحثے ہوتے تھے [ابوالمعالی جس کا قول ابن رشد نے نقل کیا ہے] تو آئن سٹائن کا موجودہ نظریہ انکو اتنا اجنبی نہ معلوم ہو۔ اس کے علاوہ جدید استقرائی منطق سے اسے جو بیگانگی ہے وہ بہت کچھ کم ہوجائے۔ اگر اس کو یہ علم ہو کہ جدید منطق کا تمام نظام رازی کے ان مشہور ومعروف اعتراضات سے وجود میں آیا جو انہوں نے ارسطو کے استخراجی منطق پر عائد کیے تھے۔ اس قسم کے عالموں کا تیار کرنا ازبس ضروری ہے۔ کیونکہ جدید علم کے اخذ وجذب کرنے میں صرف یہی لوگ مدد کر سکتے ہیں۔ [رینے گینوں اور حسین نصر کے مکتب فکر کی کتابیں جن کے پاکستان میں علمی و روحانی وارث سہیل عمر صاحب ہیں اقبال کے ان برخود غلط افکار کی مکمل تردید کے لیے کافی ہیں، مغرب کے فکر فلسفے تہذیب سائنس کو اسلام کی توسیع قرار دینا عمیر علمی وغیر تحقیقی نقطہ نظر ہے اور مغرب کے فکر وفلسفے سے سرسری واقفیت کا لازمی نتیجہ]

[۲] ہمارا پہلا مقصد جس کی بابت ہم دونوں متفق ہیں موزوں صفات کے علماء پیدا کرنا ہے جو ملت کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرسکیں۔ مگر زندگی کے متعلق ملت کے زاویہ نگاہ کے دوش بدوش ملت کی روحانی ضرورتیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ فرد کی حیثیت اس کی دماغی نجات وآزادی اور طبیعی علوم کی غیر متناہی ترقی ان چیزوں میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے اس نے جدید زندگی کے اساس کو یکسر متغیر کر دیا ہے چنانچہ جس قسم کا علم کلام اور علم دین ازمنہ متوسطہ کے مسلمان کی تسکین قلب کے لئے کافی ہوتا تھا وہ آج تسکین بخش نہیں ہے اس سے مذہب کی روح کو صدمہ پہنچانا مقصود نہیں ہے۔ اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کرنا مقصود ہے تو فکر دینی کو از سر نو تعمیر کرنا قطعاً لازمی ہے اور بہت سے مسئلوں کی طرح اس مسئلہ میں بھی سرسید احمد خاں کی دوررس نگاہ کم وبیش پیشین گوئیانہ تھی۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے انھوں نے اس کی بنیاد زیادہ ایک گزرے ہوئے عہد کے فلسفیانہ معتقدات وافکار پر رکھی مجھے اندیشہ ہے کہ میں آپ کے مسلم دینیات کے مجوزہ نصاب سے اتفاق نہیں کرسکتا۔

میرے نزدیک قدیم طرز پر مسلم دینیات کا شعبہ قائم کرنا بالکل بے سود ہے۔ اگر اس سے آپ کا یہ مقصد نہیں ہے کہ سوسائٹی کی زیادہ قدامت پسند جماعت کی تالیف قلب مدنظر ہے جہاں تک روحانیت کا تعلق ہے کہا جاسکتا ہے کہ قدیم تر دینیات فرسودہ خیالات کی حامل ہے اور جہاں تک تعلیمی حیثیت کا تعلق ہے جدید مسائل کے طلوع اور قدیم مسائل کی طرح نو کے مقابلہ میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ آج ضرورت ہے کہ دماغی اور ذہنی کاوش کی ایک نئی وادی کی طرف مہمیز کیا جائے اور ایک نئی دینیات اور علم کلام کی تعمیر و تشکیل میں اس کو برسر کار لایا جائے ظاہر ہے کہ یہ کام انہیں لوگوں کے ہاتھ انجام پاسکتا ہے جن میں اس کام کی صلاحیت ہے مگر ایسے آدمی کس طور پر پیدا کیے جائیں؟ [اس جدید علم کلام و دینیات اور روحانیات کے بغیر لاکھوں لوگ مغرب میں اسلام قبول کر چکے ہیں]

[۳] مجھے اندیشہ ہے کہ میں ہر دو امور میں ان سے اتفاق نہیں کرسکتا۔ میری رائے میں جدید اسلامی ملتوں کے لئے جدید دینیاتی افکار کی توسیع اور ترویج ضروری ہے قدیم اور جدید اصولات تعلیم کے مابین اور روحانی آزادی اور معبدی اقتدار کے مابین دنیائے اسلام میں ایک کشاکش شروع ہوگئی ہے یہ ''روح انسانیت کی تحریک'' افغانستان جیسے ملک پر اثر ڈال رہی ہے۔ آپ نے امیر افغانستان کی وہ تقریر پڑھی ہوگی جس میں انھوں نے علماء کے اختیارات کے حدود متعین کرنے کی کوشش کی ہے جدید دنیائے اسلام کی مختلف تحریکیں اسی نتیجہ کی طرف لے جاتی ہیں ان حالات کے ماتحت مسلم یونیورسٹی کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ دلیری سے اس وادی کی طرف قدم بڑھائیں اس میں شک نہیں محتاط رہنا لازمی ہوگا اور فکر و حکمت کی اصلاح میں اس طور پر عمل میں لانی ہوگی کہ معاشرتی امن وسکون میں خلل نہ آنے پائے۔ [انسان، انسانیت روح انسانیت کی تحریک کو اسلام سے جوڑنا اس صدی کا عمومی رجحان ہے روایت کے مکتبہ فکر کی کتابیں اس تصور انسانیت کی قلعی اتارنے کے لئے کافی ہیں]

[۴] میں آپ کے سوالات کا جواب بہم پہنچانے سے قاصر ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دنیائے اسلام بالخصوص مصر و ایران میں Intellectual Activity ہے اور فلسفہ اب بھی دینیات کے ساتھ زیر مطالعہ ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے مکاتب میں جواب تک پرانی روش پر قائم ہیں مغربی فلسفہ پڑھایا جاتا ہے یا نہیں فلسفہ حال کی بعض کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئی ہیں مثلاً نطشے کی ایک تصنیف کتاب الفجر کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ مجھے اطلاع ملی تھی کہ کسی شخص نے میسوپوٹیمیا میں اس کا ترجمہ کیا ہے لیکن اب تک یہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ جہاں تک مجھے علم ہے علماء نے فکر اسلامی کو فلسفہ عہد حاضر کی روشنی میں از سر نو ترتیب دینے کی کوشش نہیں فرمائی لیکن دنیائے اسلام کو جو حوادث پیش آرہے ہیں ان کی بناء پر یقین ہوتا ہے کہ اس طرف ضرور توجہ ہوگی۔ خلافت کی تنسیخ نے مصر کے بعض مفکرین کو مسئلہ آئین پر قرآن کریم کے مطالعہ کی طرف راغب کیا ہے۔ جب اسلام کی سیاسی بے چینی دور ہو چکے گی تو فلسفیانہ مسائل بھی زیر بحث آئیں گے۔ [اقبال کی یہ آرزو آج تک پوری نہ ہوسکی]

[۵] دوسرے سوال کا جواب بہت طویل ہے مگر افسوس کہ طویل خط لکھنے کی نہ ہمت ہے نہ خواہش۔ مختصراً یہ عرض ہے کہ عصبیت اور چیز ہے اور تعصب اور چیز ہے عصبیت کی جڑ حیاتی Biological ہے اور تعصب کی نفسیاتی Psychological تعصب ایک بیماری ہے جس کا علاج اطبائے روحانی اور تعلیم سے ہوسکتا ہے۔ عصبیت زندگی کا ایک خاصہ ہے جس کی پرورش اور تربیت ضروری ہے اسلام میں انفرادی اور اجتماعی عصبیت دونوں کے حدود مقرر ہیں۔ انہی کا نام شریعت ہے۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ حدود و خودی کے تعین کا نام شریعت ہے۔ [شریعت کی یہ جدید تعریفیں کیا قابل قبول ہیں؟]

[۶] احمد رضا بجنوری کے نام ۱۹۳۶ء میں لکھتے ہیں آپ نے ملکیت زمین کے متعلق امام محمد کی کسی کتب کا ذکر کیا ہے مہربانی کر کے مطلع فرمایئے کہ کتاب مذکور کہاں سے دستیاب ہوگی نام بھی کتاب کا پڑھا نہیں گیا۔[فقہ میں اقبالؒ کو سند ماننے والے اس استفسار کا مطلب سمجھ سکتے ہیں؟]

[۷] سوئیز عرب اور افریقہ کی جدائی ہے مشرق ومغرب کا اتحاد ہے دنیا کی روحانی زندگی پر مہاتما بدھ نے بھی اس قدر اثر نہیں کیا جس قدر اس مغربی اختراع نے زمانہ حال کی تجارت پر کیا ہے اس نہر نے اقوام عالم میں اس تجارتی تغیر کی بنیاد رکھی جس نے حال کی دنیا کی تہذیب وتمدن کو کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔[صرف ایک بیانیہ ہے لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی حقیقت سے عاری ہے]

[۸] میں پہلے ایک عام تجویز پیش کروں گا۔آپ کو ادارہ دینیات کو مشورہ دینا چاہیے کہ جتنی کتابیں تاریخی یا اور قسم کی یورپین اور اسلامی زبانوں میں مختلف ممالک کے مسلمانوں کے متعلق لکھی گئی ہیں وہ ان سب کو فراہم کرے یورپین کتابوں میں سے اکثر بلاشبہہ خاص اغراض کو مدنظر رکھ کر تصنیف کی گئی ہیں۔[مثلاً تبلیغی، سیاسی، تجارتی وغیرہ] تاہم ان کتابوں میں کہیں کہیں آپ کو اپنے مضمون سے متعلق نہایت مفید معلومات ملیں گی مثلاً مارشل کی اسلام چین میں ایک مشنری نے مشنری اغراض کے لئے لکھی ہے باایں ہمہ اس کتاب کے بعض حصص کے مطالعہ سے چینی مسلمانوں کے موجودہ نصب العین ان کی تحریکات اور ان کی آرزوؤں کا پتہ لگتا ہے۔مصنف نے ان کی اصلیت کے متنازع فیہ مسئلہ، ان کی موجودہ آبادی، ان کے معابد اور ان کے ادب کی نوعیت سے بھی بحث کی ہے۔ایک دوسری مثال سٹورڈرڈ کی تصنیف جدید دنیائے اسلام ہے یہ ان کتابوں میں سے ہے جو جنگ عظیم کے بعد ضبط تحریر میں آئی ہیں اور اس کے مصنف کا مقصد [جو اینگلو سیکسن نسل کی برتری کا قائل معلوم ہوتا ہے] محض ایک طرح کی سیاسی اشتہار بازی ہے تاہم یہ ایک مفید کتاب یورپین زبانوں میں لکھی ہوئی ان کتابوں کے بے شمار حوالے دیتی ہے جو اسلام اور ملت اسلامیہ پر لکھی گئی ہیں۔اس کے علاوہ وہ کتابیں ہیں جن کو سیاحوں یا حکومت ہائے یورپ کے ان سیاسی نمائندوں نے فرداً فرداً بعض اسلامی ممالک پر لکھا ہے جہاں وہ متعین تھے مثلاً برٹن اور فلبی [عرب] گوبنو [فارس] اور ویمبری [وسط ایشیا] یہ وہی ویمبری ہے جس نے مرحوم سلطان عبدالحمید کو بتایا تھا کہ اسلام کے حلقہ بگوش ہونے سے قبل ترک اپنے مخصوص رسم الخط کے مالک تھے۔

یہ سب کتابیں جمع کرنی چاہییں اور اپنے خطبات کی ترتیب وتیاری میں آپ کو ان سے مدد لینی چاہیے۔ میسرز لوزک اینڈ کمپنی برٹش میوزیم لندن سے مراسلت کیجیے ان کی فہرست کتب سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یورپین مستشرقین نے اسلامی تمدن پر کتنا زبردست ذخیرہ فراہم کیا ہے۔اس سلسلہ میں آپ کا لائپزگ [جرمنی] کے پروفیسر ڈاکٹر فشر سے مراسلت کرنا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔میرا خیال ہے کہ وہ آپ کے مضمون کے متعلق قیمتی مشورے دے سکیں گے۔اگر آپ خود ان سے واقف نہیں تو خط میں میرا حوالہ دے دیجیے گا۔اس سلسلہ میں ڈاکٹر زویمر کا بھی نام لوں گا جو قاہرہ میں ایک امریکن مشنری ہیں۔وہ اسلام کی مخالفت میں ایک رسالہ مسلم ورلڈ کی ادارت بھی کرتے ہیں لیکن انھوں نے متعدد کتابوں اور مضامین کی صورت میں ملت اسلامی پر بہت کچھ لکھا ہے۔گزشتہ سال وہ لاہور آئے تھے اور انھوں نے جرمن زبان میں مجھے ایک کتاب دکھائی تھی جس میں اسلام اور ملت اسلام پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے عنوانات درج تھے میں اس کے مصنف کا نام بھول گیا ہوں مگر یہ آسانی سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔اگر آپ ڈاکٹر زویمر کو لکھیں تو وہ آپ کو بتا دیں گے یہ کتاب حال میں شائع ہوئی ہے اور اس سے اغلباً آپ کو ایسی کتابوں کے نام ملیں گے جو آپ کے مضمون سے متعلق ہیں پروفیسر ہارڈٹز افرینکفورٹ جرمنی سے بھی مشورہ کیا جا سکتا ہے۔[اقبال نے اس خط میں صرف یوروپی کتابوں کے حوالوں سے حوالے دیے

ہیں عربی اور فارسی کتابوں اور ماخذات کا ان میں کوئی ذکر نہیں ہے ان کی معلومات کا دائرہ بیشتر انگریزی کتابوں اور مستشرقین کی تحقیقات پر منحصر تھا]

[۹] آخر میں ایک نہایت اہم تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں گو اس کا تعلق اس خط کے مضمون سے نہیں ہے ادارہ دینیات کو چاہیے کہ دینیات کی ایک پروفیسر شپ قائم کرے جس پر کسی ایسے شخص کو متعین کیا جائے جس نے اسلامی دینیات اور جدید یورپین فکر وتصور کا مطالعہ کیا ہو تا کہ وہ مسلم دینیات کو افکار جدیدہ کا ہم دوش بنا سکے۔ قدیم اسلامی دینیات کے [جس کا ماخذ زیادہ تر یونانی حکمت وفکر تھا] تار و پود بکھر چکے ہیں اب وقت آچکا ہے کہ اس کی شیرازہ بندی کی جائے۔ ترکی کو چاہیے کہ جس طور پر وہ اور معاملات میں پیش قدمی کر رہی ہے۔ اس معاملہ میں بھی پیش قدمی کرے یورپ نے عقل والہام کو ہم آہنگ بنانا ہم سے سیکھا ہے وہ اپنے دینیات کو موجودہ فلسفہ کی روشنی میں از سر نو تعمیر کرنے میں ہم سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ اسلام کہ عیسائیت سے کہیں زیادہ سادہ اور عقلی مذہب ہے اس شعبہ میں کیوں بے حس وحرکت رہے ادارہ دینیات کو ایک جدید علم کلام کی طرح ڈالنی چاہیے اور ترکی کی نوخیز نسل کو یورپ کی لامذہبیت سے محفوظ ومصئون کر لینا چاہیے۔ مذہب، قوم میں ایک متوازن سیرت پیدا کرتا ہے جو حیات ملی کے مختلف پہلوؤں کے لئے بیش بہا ترین سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

[۱۰] ذاتی طور پر دینیات سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تاہم میں اس میں بھی دخیل ہوا تا کہ احمدیوں کو انہی کی زبان میں جواب دیا جاسکے۔ [نہرو کے نام خط]

[۱۱] میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریمؐ زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی ان کی صحبت سے اس طرح مستفیض ہو سکتے ہیں جس طرح صحابہ کرام ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں تو اس قسم کے عقائد کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار ہوگا اس واسطے خاموش رہتا ہوں۔ [کیا اقبالؒ نے خطبات لکھتے ہوئے نبی کریمؐ سے براہِ راست استفادہ فرمایا امت اور ماخذات دین کی اصلاح کرتے ہوئے وہ رسول کریم سے دانستہ استفادے کی سعادت سے کیوں محروم رہے اگر استفادہ کیا تھا تو اقبال اکادمی کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟]

[۱۲] ڈیک آرٹ پر مضمون لکھنے کی اب مجھ میں ہمت باقی نہیں رہی۔ اگر آپ کو پیرس میں نوجوان عمر کا سکالرمل جائے تو اس سے یہ کہنا کہ ڈیک آرٹ کی مشہور کتاب Method کا امام غزالی کی احیاء العلوم سے مقابلہ کرے اور یورپ والوں کو دکھائے کہ ڈیک آرٹ اپنے اس Method کے لئے جس نے یورپ میں نئے علوم کی بنیاد رکھی، کہاں تک مسلمانوں کا ممنون احسان ہے مغربی فلسفہ کا مورخ Lawss تو یہ لکھتا ہے کہ اگر ڈیک آرٹ عربی زبان کا عالم ہوتا تو ہم اُسے غزالی کی احیاء العلوم سے چوری کرنے کا الزام لگاتے۔ لیکن اٹلی کا مشہور شاعر دانتے بھی تو شاید عربی نہ جانتا تھا لیکن اس کی کتاب Dante Comedy شاید محی الدین عربیؒ کے افکار وتخیلات سے لبریز ہے حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے نتائج افکار عام طور پر یورپ میں مشہور تھے اور یورپ کے بڑے بڑے مفکر اور تعلیم یافتہ آدمی خواہ وہ عربی جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں عام طور پر اسلامی تخیلات سے آشنا تھے۔

انگریزی کتابوں میں ہم ہندی مسلمانوں کو یہ سکھایا ہے کہ منطق استقرائی کا موجد بیکن Bacon تھا لیکن فلسفۂ اسلامی کی تاریخ بتاتی ہے کہ یورپ میں اس سے بڑا جھوٹ آج تک نہیں بولا گیا۔ ارسطو کی منطق کی شکل اول پر سب سے پہلے اعتراض کرنے والا ایک مسلمان منطقی تھا۔ یہی اعتراض John Stuart Mill کی کتابوں میں دہرایا گیا ہے اور مسلمانوں کا استقرائی طریق بیکن سے مدتوں پہلے سارے یورپ کو معلوم تھا۔

محمود خضیری سے میں سپین میں ملا تھا۔ وہ اس وقت فقہ اسلامیہ پر ریسرچ کر رہے تھے نہایت نیک نوجوان ہیں مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ نصیر الدین طوسی پر مقالہ پڑھیں گے۔ ان سے کہیے کہ نصیر الدین طوسی کی تحریروں کا وہ حصہ جس میں طوسی نے Euclid کے Parallel Postulate کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، بالخصوص مطالعہ کریں بلکہ اسی ضمن میں ان کے معاصرین کی تحریروں کا مطالعہ بھی کریں۔ اس تحقیق سے ان کو معلوم ہوگا کہ مسلمان ریاضی دان قرون وسطیٰ ہی میں اس نتیجہ تک پہنچ چکے تھے یہ ممکن ہے کہ مکان کے ابعاد [Dimensions] تین سے زیادہ ہوں اور ہمارے اسلامی صوفیہ تو ایک مدت سے تعدد زمان و مکان کے قائل ہیں۔ یہ خیال یورپ میں سب سے پہلے جرمنی کے فلسفی Kant نے پیدا کیا تھا۔ لیکن مسلمان صوفیہ اس سے پانچ چھ سو سال پہلے اس نکتہ سے آشنا تھے۔ عراقی کے رسالے کا قلمی نسخہ غالباً ہندوستان میں موجود ہے اور میں نے ان کے ایک رسالہ کا جو خاص طور پر زمان اور مکان پر ہے اپنے لیکچروں میں ملخص بھی دیا ہے۔ اگر محمود خضیری بھی اس مضمون پر ریسرچ کریں تو مجھ کو یقین ہے کہ یورپ میں نام پیدا کریں گے۔ یورپ کی قوموں نے ایک اعلیٰ کلچر کی بنیاد رکھی ہے مگر افسوس کہ ان کا عمل اس کلچر کے مقتضیات کے خلاف ہے۔ [یہ معذرت خواہانہ جدیدیت عیسائیت کے عہد زوال کا بروز ہے جو یونانی سائنس کی جدید سائنس سے شکست کے بعد ہر سائنسی ایجاد کے لئے بائبل کی کسی آیت کو سند کے طور پر پیش کرتی تھی عیسائیت کی الٰہیات میں یونانی فلسفہ و سائنس کی آمیزش نے اسے تباہ کیا یہی تاریخ مسلم جدیدیت پسند ملت اسلامیہ کے ساتھ دہرانا چاہتے ہیں روایت کے مکتبہ فکر کی کتابیں جن کے پاکستان میں مناد سہیل عمر صاحب ہیں معذرت خواہانہ جدیدیت کا عمدہ نقد پیش کرتی ہیں]

[۱۳] حضرت خواجہ صاحب کی خدمت میں میری طرف سے خاص طور پر شکریہ ادا کیجیے میں ان کا نہایت شکر گزار ہوں کہ انھوں نے سرالسما کے متعلق اس قدر دلچسپی کا اظہار فرمایا۔ معلوم نہیں حجم کس قدر ہے اور کس زبان میں ہے بہر حال اگر خواجہ صاحب کسی آدمی کو بھیج دیں تو بہت مہربانی ہوگی۔ اس طرح کتاب جلدی مل جائے گی اور میں اس سے اپنی کتاب کو ختم کرنے سے پہلے مستفیض ہوسکوں گا میں نے شاید آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ میرا مقصود سرالسما کے مطالعہ سے علمی تحقیقات نہیں ہے علمی سے میری مراد وہ تحقیق ہے جس کا دارو مدار علم ریاضی پر ہو جس کے مشاہدات کے لئے دوربینوں کی ضرورت ہو۔ میرا مقصود اس تحقیق سے ہے جس کی بنا مکاشفات قلبی پر ہو۔ چونکہ آپ کے والد ماجد سرالسما کو دیکھ چکے ہیں اس واسطے مجھے یقین ہے کہ اس کے مطالعہ سے گوہر مقصود ہاتھ آئے گا۔ حضرت خواجہ صاحب کی خدمت میں عرض کیجیے۔ جب میری کتاب ختم ہوگی تو انشاءاللہ اس کی ایک جلد حاضر خدمت کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ بے انتہا خوش ہوں گے جہاں تک میرا علم ہے کسی اسلامی زبان میں اس قسم کی کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی۔

مقرر کردہ بزرگ مولوی احمد سعید صاحب کی موجودگی میں کتابِ مذکورہ کا وہ حصہ دیکھیں جس کا تعلق سیاراتِ سماوی اور متعلقہ (امور سے) ہے اگر وہ کتاب علم ہیئت کی ہے تو اس کی ضرورت نہیں [یعنی میرے مقاصد کے لئے] اور اگر اس کے [مضامین] مکاشفاتی ہیں تو جستہ جستہ نوٹ سیارات کے متعلق اس کتاب سے لے لیے جائیں اور مجھ کو وہ نوٹ [ارسال] کر دیے جائیں۔ [اس پر عبارت پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں] اس طرح ۱۹۱۷ء میں اقبال فقہ اسلامی پر مفصل کتاب لکھ رہے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں تصوف پر کتاب تالیف کر رہے تھے، کتابوں کے بے شمار منصوبے آپ کو خطوط اقبال میں مل جائیں گے۔

[۱۴] ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں ان کو عربی اسلام سے اور اس کے

نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے ہوئی۔ صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر ایک حملہ تصور کیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے انشاء اللہ دوسرے حصے میں دکھاؤں گا کہ تصوف کیا ہے اور کہاں سے آیا اور صحابہ کرامؓ کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے جس کا تصوف حامی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے یہ ایک نہایت Subtle طریق تمسیخ کا ہے۔ اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعرا ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشو ونما نہ ہونے دیا؛ تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا یا بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی ان شعرا نے نہایت عجیب وغریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تمسیخ کی ہیا اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔ اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم نسائی افلاس کو اعلیٰ درجہ کی سعادت قرار دیتا ہے۔ اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لئے ضروری تصور کرتا ہے۔ تو شعرائے عجم اس شعارِ اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں۔ [اس دعوے کے ساتھ تاریخ تصوف لکھی جا رہی تھی لیکن خواجہ حسن نظامی کی یلغار نے اقبال کو پسپا کر دیا سہیل عمر صاحب دعوی کرتے ہیں کہ اقبال کسی سے نہ ڈرتے تھے]

[۱۵] دینی فکر عملاً ساکن ہے ایک وقت تھا کہ یورپی فکر کو محرکات اسلامی دنیا سے ملتے تھے عصر جدید کی تاریخ کا سب سے زیادہ قابل توجہ واقعہ یہ واقعہ ہے کہ اسلامی دنیا انتہائی تیز رفتاری سے روحانی [فکری] طور پر مغرب کی طرف بڑھ رہی ہے اس پیش قدمی میں کوئی برائی نہیں کیونکہ فکری سطح پر یوروپی ثقافت دراصل اسلامی ثقافت کے انتہائی اہم مدارج کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ [خطبات میں اقبال کا یہ موقف معذرت خواہی کے سوا کیا ہے مغرب سے مرعوبیت سطر سطر سے جھلک رہی ہے احساس کمتری کا ازالہ یا امالہ اس تصور سے کیا جا رہا ہے کہ مغرب جو کچھ ہے وہ نہیں ہے وہ تو ہماری ہی توسیع شدہ شکل ہے۔ زوال کے دنوں میں بھی اپنی پرستش کیوں؟]

عطیہ فیضی کے نام ۱۹۰۹ء میں اقبال نے لکھا تھا کہ دوزخ تو برفستان ہے میری حیرت پر ارباب دوزخ نے کہا کہ اس کو گرمانے کے لئے ہر شخص اپنا ایندھن ساتھ لاتا ہے میں بھی اس سلسلے میں امکان بھر کوئلہ جمع کرنے کی فکر میں ہوں لیکن یہاں کوئلہ کی کانوں کی قلت ہے۔

اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

مغرب سے واپسی کے بعد کچھ عرصے کے لئے مغرب کے زیر اثر مغرب کی کوئلے کی کانوں سے اقبالؒ نے خطبات کے کچھ کوئلے جمع کئے لیکن اس مرد مومن نے رجوع کر لیا اور اپنے حصے کے تمام کوئلے، انگارے، کانیں دنیا میں چھوڑ دیں اور گوشہ فردوس میں جا گزیں ہو گیا لیکن اقبال اکادمی کی بھرپور کوشش ہے کہ یہ انگارے اقبال کو ارسال کر دیے جائیں اس کوشش پر اقبال کے ممدوح غالب کی زبان میں یہی کہا جا سکتا ہے۔

ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو